دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۱۸۶ ماہ رمضان المبارک ۱۴۳۱ھ مطابق ماہ اگست ۲۰۱۰ء عدد ۲

فہرست مضامین

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی

پوسٹ بکس نمبر: ۹۱

شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)

پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

شذرات

ابھی گذرے رجب کی ۲۸/تاریخ کو ہجری کیلنڈر کے مطابق خلافت عثمانیہ کے سقوط پر ۸۹ سال پورے ہوگئے۔ دور حاضر میں اسلامی تاریخ کا یہ سب سے بڑا المیہ ۲۸/رجب ۱۳۴۲ ہجری مطابق ۳/مارچ ۱۹۲۴ء کو پیش آیا جب مصطفیٰ کمال پاشا کے ہاتھوں ترک اپنے سب سے بڑے اعزاز سے محروم کردیے گئے۔ مصطفیٰ کمال پاشا نے جس جدید ترکی کی بنیاد رکھی اس کا اپنے ماضی سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ اس کا سرمایہ افتخار دین و مذہب کے بجائے سیکولرازم تھا۔ اس سیکولر تصور حکومت میں مذہب بیزاری اس طرح رچی بسی ہوئی تھی کہ اتنا طویل عرصہ گذر جانے کے باوجود ترک قوم اس کے اثرات بد سے نجات حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکی ہے۔ مصطفیٰ کمال پاشا اور ان کے ہمنواؤں نے جدید ترکی کے لیے جو سمت سفر متعین کی اس سے اسلام کے اس قدیم خدمت گذار ملک کا، جس نے سینکڑوں سال مرکز خلافت کی حیثیت سے اسلامی دنیا کی قیادت کی تھی، نصب العین اس حد تک بدل گیا کہ اس کا اسلامی دنیا کے معاملات اور مسائل سے کوئی سروکار نہیں رہ گیا۔ چنانچہ اسرائیل کا ناجائز وجود جو سقوط خلافت کے نتائج بد میں شامل تھا، نہ صرف یہ کہ ترکی کے لیے قابل قبول ٹھہرا بلکہ وہ اسے تسلیم کرنے والے ابتدائی ممالک میں شامل تھا۔ یہ صحیح ہے کہ سقوط خلافت کے وقت خلافت عثمانیہ کی حالت کسی طرح بھی قابل اطمینان نہیں تھی۔ اس وقت اس کی شناخت یوروپ کے مرد بیمار کی تھی لیکن تمام ترکمیوں اور کمزوریوں کے باوجود اس کی برکتیں بے شمار تھیں۔ نفسیاتی اور علامتی طور پر عالم اسلام کے لیے اس کی اہمیت غیر معمولی تھی۔ خلافت اتحاد امت کی ایک علامت تھی۔ خلافت کی اہمیت کو مسلمانوں سے زیادہ اغیار جانتے اور سمجھتے تھے۔ وہ اس نکتہ سے واقف تھے کہ خلافت کا ادارہ جسدِ ملی میں شہ رگ کی حیثیت رکھتا ہے اور اگر اسے کاٹ دیا جائے تو اس کی حیثیت ایک لاشہ بے جان سے زیادہ نہیں رہ جائے گی۔ چنانچہ برطانوی گورنمنٹ جس نے اس سلسلہ میں کلیدی کردار ادا کیا تھا، یہ نتیجہ نکالنے میں حق بجانب تھی کہ ''ترکی کو اس طرح تباہ کردیا گیا ہے کہ وہ دوبارہ سنبھلنے کے لائق نہیں ہوسکے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اس کی روحانی طاقت کے سرچشمہ کو تباہ کردیا ہے۔ ہم نے یہاں سے خلافت اور اسلام کو ختم کردیا ہے''، وہ اس بات کو اچھی طرح جانتے تھے کہ خلافت پر تیشہ کی زد دراصل اسلام پر پڑے گی۔

ترک قوم اس دشت بے اماں میں مدتوں بھٹکتی رہی، کمالی وراثت کے محافظ کی حیثیت سے فوج نے اپنے سر یہ ذمہ داری لی کہ اسے اس سے باہر نکلنے کا کوئی موقع نہ ملنے پائے۔ ترک بنیادی طور پر اسلام کے شیدائی ہیں لیکن ان کے چاروں طرف ایسے اداروں اور اقدار کی باڑھ قائم کر دی گئی کہ ان کے فطری مذہبی جذبات کا اظہار اور روزمرہ کی زندگی میں ان کا انعکاس ممکن نہ رہ جائے۔ اس کی ایک چھوٹی سی مثال کے طور پر حجاب کے مسئلہ کو لیا جاسکتا ہے۔ مصطفیٰ کمال پاشا نے حجاب کو ممنوع قرار دے دیا تھا۔ ان کے خیال میں یہ ترقی کی راہ میں ایک بہت بڑی رکاوٹ کی حیثیت رکھتا تھا۔ ایک مدت تک ترک بے حجاب رہے لیکن جب اس سلسلہ میں ان کا احساس بیدار ہونا۔ شروع ہوا تو ۱۹۸۰ء میں فوج نے اس کی ممانعت کا قانون نافذ کر دیا۔ جب اس کے باوجود اس رجحان پر قابو نہ پایا جاسکا تو ۱۹۹۷ میں اس قانون کو مزید سخت کر دیا گیا۔ چنانچہ سر ڈھکنے کے جرم میں ایک منتخب خاتون رکن پارلیمان کو اپنی رکنیت سے محروم ہونا پڑا۔ رجب طیب اردگان کی قیادت میں موجودہ حکومت نے ۷/فروری ۲۰۰۸ء کو ۹۷ بڑی اکثریت سے پارلیمنٹ میں ایک قانون پاس کیا جس کی رو سے ترک خواتین کو سر ڈھکنے کی آزادی ملی لیکن ابھی ملک میں سیکولرازم کی گرفت اتنی مضبوط ہے کہ چند ہی مہینوں بعد ۵/جون کو ترکی کی کانسٹی ٹیوشنل کورٹ نے اتنی بھاری اکثریت سے پاس کیے گئے اس قانون کو کالعدم قرار دے دیا۔ چنانچہ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے والی طالبات اپنا سر نہیں ڈھک سکتیں۔ آج کے دن بھی سر ڈھکنے پر اصرار کرنے والی طالبات کے لیے ترکی میں اعلیٰ تعلیم کے دروازے بند ہیں۔ یہ تو محض ایک مثال تھی ورنہ اسلام پسند ترکوں کو روزمرہ کی زندگی میں اس قسم کی بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ موجودہ اسلام پسند حکمرانوں کو بھی انہیں مسائل اور دشواریوں کے درمیان کام کرنا ہے۔ ترک عوام کی غالب اکثریت کی آرزوؤں اور امنگوں کے سامنے یہ ادارے ایک دن یقیناً سرنگوں ہو جائیں گے لیکن شاید اس وقت کے آنے میں کچھ دیر ہے۔

اتنے موانع اور مشکلات کے باوجود یہ کون سوچ سکتا تھا کہ ترکی میں اسلام کی طرف واپسی کا عمل نہ صرف جاری رہے گا بلکہ ترکی عالم اسلام میں قائدانہ حیثیت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اتنی کم مدت میں موجودہ حکمرانوں کی زیر قیادت ترکی نے یہ مقام کیسے حاصل کیا یہ عزیمت، بیدار مغزی اور قائدانہ صلاحیت کی ایک غیر معمولی داستان ہے۔ اس کے لیے زمین ہموار کرنے کا کام تو

کئی اور لوگوں نے انجام دیا جن کا نام ترکی میں احیاء اسلام کی تاریخ میں سنہرے حروف میں لکھا جائے گا لیکن اس میں بڑا حصہ موجودہ وزیر اعظم رجب طیب اردگان کا ہے۔ جن کی قیادت میں ایک طرف تو ترکی نے غیر معمولی معاشی استحکام حاصل کیا جو بجائے خود ایک بڑا کارنامہ ہے۔ ان کو ایک نہایت بدحال معیشت وراثت میں ملی تھی جو حکمراں طبقوں میں وسیع پیمانے پر پھیلے ہوئے کرپشن کی وجہ سے تباہی کے کگار پر تھی۔ ان حالات میں یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا کہ اتنی مختصر مدت میں ترکی یوروپین یونین کی رکنیت کے لیے ایک مضبوط دعوے دار بن کر ابھرے گا۔ دوسری طرف ترک عوام کی اسلام کی طرف واپسی ایک حقیقت واقعہ کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ سعودی حکمراں شاہ عبداللہ نے جنہیں خادم الحرمین الشریفین کی حیثیت سے اسلامی دنیا میں ایک خاص مقام حاصل ہے، اسلامی خدمات کے اعتراف میں ترک وزیر اعظم کو کنگ فیصل انٹرنیشنل پرائز تفویض کیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ اس وقت عالمی سیاسی منظر نامہ میں ترکی کو جو مقام حاصل ہے وہ خطہ کے کسی دوسرے ملک کو حاصل نہیں۔ خاص طور سے مشرق وسطیٰ کے بے حد الجھے ہوئے مسائل کے پس منظر میں ترکی جو کردار ادا کر رہا ہے اسے غیر معمولی ہی کہا جاسکتا ہے۔ واضح طور پر ترکی خارجہ پالیسی کے میدان میں اپنے عثمانی ورثہ کی بازیافت کو بنیادی اہمیت دے رہا ہے۔ غزہ، ایران اور شام کے سلسلہ میں ترکی کلیدی کردار ادا کر رہا ہے۔ چنانچہ جب اپنی صدارت کے ابتدائی دنوں میں صدر اوبامہ نے ترکی کے دورہ کا منصوبہ بنایا تو یہ دراصل عالمی سیاسی سطح پر ترکی کی بڑھتی ہوئی اہمیت اور امریکہ کی نئی خارجہ پالیسی کے پس منظر میں ترکی کے تعاون کی ناگزیر ضرورت کا اعتراف تھا۔ یہ اتفاق نہیں تھا کہ دنیا کو یہ پیغام دینے کے لیے کہ امریکہ اور اسلام حالت جنگ میں نہیں ہیں صدر نے انقرہ کا انتخاب کیا۔ اسے اسلامی دنیا سے امریکہ کے تعلقات کے میدان میں ایک نئی ابتداء تصور کیا گیا۔ اسی طرح ابھی جولائی کے آخر میں برطانوی وزیر اعظم ڈیوڈ کیمرون کا ترکی کا دورہ عالمی سیاست میں ترکی کی بڑھتی ہوئی اہمیت کا غماز ہے۔ اپنے معاشی استحکام، اسٹریٹجک اہمیت اور عالم اسلام میں اپنے وقار کی وجہ سے ترکی مغرب کے لیے غیر معمولی اہمیت حاصل کر چکا ہے۔ انقرہ میں کیمرون کی تقریر سے، جس کو اسرائیلی مبصرین نے ترکی کی کاسہ لیسی سے تعبیر کیا ہے، یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ اس وقت ترکی کو مغرب کی جتنی ضرورت ہے اس سے کہیں زیادہ مغرب کو ترکی کی ضرورت ہے۔ رجب طیب اردگان کی قیادت کا اس سے بڑا اعتراف نہیں ہوسکتا۔

مقالات

سرورالمحزون کا تنقیدی مطالعہ

پروفیسر ڈاکٹر محمد یاسین مظہر صدیقی

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اپنے ایک مکتوب بنام شاہ محمد عاشق پھلتیؒ میں نورالعیون کے ترجمہ کا ذکر کیا ہے اور اس ترجمہ کا نام شاہ پھلتیؒ کی صواب دید پر منحصر کیا ہے۔ اس کے لیے انہوں نے ترجمہ نورالعیون کو ان کے پاس بذریعہ قاصد بھیجا۔ اس گرامی نامے اور تصانیف ولی اللہی کے باب میں شاہ پھلتیؒ کی کارفرمائی کی متواتر سنت سے یہ یقینی ہو جاتا ہے کہ اس ترجمہ نورالعیون کا نام ''سرورالمحزون فی ترجمۃ نورالعیون'' شاہ محمد عاشق پھلتیؒ ہی کا رکھا ہوا ہے۔ اسے حضرت شاہؒ نے پسند فرمایا تھا اور وہی سکہ رائج الوقت بن گیا۔ (نادر مکتوبات حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، پھلت ۱۹۹۷ء، ۱/۲۱۳؛ مکتوب ۳۶)

سرورالمحزون کے پورے عنوان سے اس کا ترجمہ نورالعیون ہونا ثابت ہی ہوتا ہے اس کے مختصر ترین مقدمۂ مترجم سے بھی اس کی مزید تائید ہوتی ہے۔ حضرت شاہؒ نے صراحت کی ہے کہ ان کے ''بعض اعزہ احباب و اجلہ اولی الالباب'' نے کتاب نورالعیون فی تلخیص سیر الامین المامون مولفہ علامہ زمان شیخ ابوالفتح محمد بن محمد المشتہر بسید الناس کے ترجمہ کی ان سے فرمائش کی تھی اور اس کی تعمیل کرنے کے سوا دوسرا چارہ نہ تھا لہذا ترجمہ کیا البتہ بعض مقامات پر کسی روایت کے ضعف کی وجہ سے جو مولف نے اختیار کی تھی یا اس جیسے اسباب سے کمی بیشی اور تبدیلی اور تصرف فرمایا ہے (''...... بزیادت ونقص وتبدیل وتصرف کرد......'' - سرورالمحزون، مطبع مجتبائی دہلی ۱۲۵۶ء)

۲۔ مترجم گرامی کی ان تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ سرورالمحزون امام ابن سید الناس

ڈائرکٹر شاہ ولی اللہ دہلوی، ریسرچ سیل، ادارہ علوم اسلامیہ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

کی کتاب نورالعیون کا ترجمہ ہے، اس میں کمی بیشی کی گئی ہے اور تبدیلی و تصرف کو بھی حضرت مترجم نے روا رکھا ہے۔

شاہ ولی اللہؒ کے معاصرین اور متاخرین دونوں نے اسے نورالعیون ہی کا ترجمہ گردانا ہے۔ حضرت مترجم کی حیات بابرکات میں بلکہ ترجمہ کی تالیف کے معاً بعد ہی ۱۱۴۸ھ/۱۷۳۵ء میں معاصر کاتبوں نے اسے ترجمہ ہی قرار دیا ہے۔ چنانچہ سرورالمحزون کا قدیم ترین مخطوطہ یہی بتاتا ہے۔ وہ اسے ترجمہ نورالعیون قرار دیتا ہے۔ اس کے کاتب واحد علی نامی ایک طالب العلم تھے اور انہوں نے حضرت مولوی شمس الدین صاحب کی فرمائش پر کتابت کی تھی۔ غالباً یہ بزرگ حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ ہیں جیسا کہ خاکسار راقم نے اپنے مقالہ ''سرورالمحزون کا سنۂ تالیف'' میں ذکر کیا ہے۔ (سرورالمحزون فی ترجمۂ نورالعیون، سبحان اللہ کلکشن (مسلم یونیورسٹی، مولانا آزاد لائبریری) ۹۲۰/۵۰ف ضمیمہ، ورق-۳۲)

متاخرین میں متعدد اہل قلم نے نورالعیون کو تو امام ابن سیدالناس کی مفصل کتاب ''سیرت عیون الاثر فی فنون المغازی والشمائل والسیر'' کا خلاصہ یا جامع خلاصہ ضرور قرار دیا ہے جو حضرت مولف و تلخیص نگار کے دعوے سے دھوکا کھا گئے مگر انہوں نے سرورالمحزون کو نورالعیون کا فارسی ترجمہ ہی بتایا ہے۔ ان میں مفتی محمد مظہر بقا، اطہر عباس رضوی وغیرہ شامل ہیں۔ (محمد مظہر بقا، اصول فقہ اور شاہ ولی اللہ، کراچی ۱۹۸۶ء، ۱۳۹ بحوالہ معراج محمد بارق مترجم اردو سرورالمحزون، اطہر عباس رضوی، شاہ ولی اللہ اینڈ ہز ٹائمس، کینبرا، ۱۹۸۰ء، ۲۲۴)

ایسی ''واضح تصریحات'' کے باوجود بعض علمائے کرام نے نہ جانے کیسے اور کیوں سرورالمحزون کو نورالعیون کا خلاصہ قرار دے دیا۔ ان میں دو معاصر بزرگوں کی شمولیت حیرت انگیز ہے۔ ان میں سے ایک مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ ہیں جن کا بیان ہے کہ ''سرورالمحزون (فارسی) ابن سیدالناس کی سیرت پر مشہور کتاب ''نورالعیون فی سیر الامین المامون'' کا خلاصہ ہے''۔ دوسری عظیم شخصیت مولانا سعید احمد پالن پوری ماہر ولی اللّٰہیات اور شارح حجۃ کی ہے: ''......پھر اس کا جامع خلاصہ ''نورالعیون فی تلخیص سیر الامین المامون'' کے نام سے کیا تھا۔ شاہ صاحبؒ نے اس کا فارسی میں خلاصہ کیا ہے......''۔ (ابوالحسن علی ندوی، تاریخ دعوت وعزیمت، لکھنؤ ۱۹۸۴ء

۵/۶-۴۰ : نور العیون کا صحیح عنوان نہیں لکھا گیا۔ سعید احمد پالن پوری، رحمۃ اللہ الواسعہ ، دیوبند ۲۰۰۱ء، ۴۳/۱)

بزرگان دین، اکابر ملت اور صاحبان علم و تحقیق کے بیانات کے تضاد سے ایک حقیقت سامنے آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ کسی بھی شخص کی بات کو جوں کا توں قبول نہیں کرنا چاہیے، خواہ وہ شخص کتنا ہی بڑا عالم و متقی اور بزرگ ہو، اسلامی روایت نقد و قبول بھی یہی ہے۔ قرآن مجید کی تدوین کے وقت مدون حضرات نے سینوں میں محفوظ ہونے کے باوجود جب سفینوں سے آیات کریمہ کو جمع کرنا شروع کیا تو ان کی کتابت وغیرہ پر شہادتیں طلب کیں اور بلا شہادت تحریر قبول نہ کی۔ یہ واضح رہے کہ یہ شہادتیں تحریری چیز پر لی گئی تھیں، قرآن مجید کی کسی آیت کریمہ یا سورہ مقدسہ پر ان کو ذرا شک نہ تھا جمع و تدوین قرآن کے سلسلے میں کام کرنے والوں نے بالخصوص مستشرقین نے ان روایات کی غلط ترجمانی کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان مدونین و جامعین کو آیات کریمہ ہی کے بارے میں کوئی شبہ تھا۔ ایسا ہرگز نہ تھا۔ تحریری چیزوں کا ثبوت بلکہ ان کے استناد کا ثبوت مانگا گیا تھا۔ یہ دوسرا موضوع ہے، سر دست صرف اصول اخذ و نقد سے بحث ہے۔

اسی طرح حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت ابوہریرہؓ یا بعض دوسرے صحابہ کرام وغیرہ سے حدیث کا ثبوت مانگا تھا اس کا تعلق بھی حدیث کی صحت سے نہ تھا۔ حدیث تو ان کے نزدیک صحیح ہی تھی، اس کی روایت کی صحت اور بیان کرنے والے صحابی کے ''ضبط حدیث'' کی صحت پر شہادت طلب کی تھی۔ اسی اصول نقد و قبول اور قاعدہ رد و استرداد پر بعد میں محدثین کرام نے جرح و تعدیل کے اصول مقرر کیے اور ان پر کتابیں لکھیں۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے خوب لکھا ہے کہ ہر حدیث کی رسول اکرم ﷺ سے نسبت کا معاملہ طے کر لینا ضروری ہے تاکہ غلط بات آنحضرت ﷺ کی طرف قطعی منسوب نہ ہو۔

بلاشبہ بزرگوں کے بیانات و تصریحات پر شبہ کرنے کی بجائے ہر بات کو بلا نقد قبول کرنے کے اصول سے بحث ہو رہی ہے۔ حضرت شاہؒ نے اپنے بہت سے اکابر کے بیانات و آراء کو اسی اصول کی بنا پر قبول نہیں کیا۔ لہٰذا ان ہی کے اصول نقد پر ان کے دعوے کو پرکھنا ہے۔ اسی مقصد سے سرور المحزون کا تنقیدی مطالعہ کیا جانا ضروری ہے تاکہ حضرت شاہ کی ''زیادت و

نقص اور تبدیل وتصرف'' کی نوعیت جانی جاسکی۔ یہ ہمارا کارنامہ نہیں ہے، حضرت شاہؒ اور ان کے اکابر اہل علم کا سکھایا ہوا طریقہ ہے۔ کیونکہ اصل معیار تو ''حق'' کی اتباع ہے، شخص کی پیروی یا کورانہ تقلید نہیں۔

عربی متن اور فارسی ترجمہ کا تقابلی مطالعہ: چونکہ حضرت شاہؒ کا رسالہ سیرت - سرور المحزون - امام ابن سید الناس کے عربی مختصر سیرت - نور العیون - کا فارسی ترجمہ ہے لہذا ان دونوں کے متن و ترجمہ کا تقابلی مطالعہ لازمی ہوجاتا ہے۔ اس مطالعہ کی کئی جہات بن جاتی ہیں: اول عربی متن کا فارسی ترجمہ کس حد تک وفادار، صحیح اور معتبر ہے اور اس ترجمہ کا ادبی ولغوی معیار و مرتبہ کیا ہے۔ دوم حضرت شاہؒ نے ''زیادت'' کے باب میں کیا کیا زیادتی کی ہے، ان کے اضافات کی نوعیت اور قدر و قیمت کیا ہے؟ سوم حضرت شاہؒ نے ''نقص'' کے تعلق سے کس کس چیز کو خارج کیا ہے، ضعیف روایات کی نوعیت کیا ہے اور ان کے اخراج کی صورت کیا ہے؟ چہارم حضرت شاہؒ نے ''تبدیل وتصرف'' کی جو بات کہی ہے وہ زیادت ونقص کے باب سے تعلق رکھتی ہے یا ان کے علاوہ کچھ اور بھی ہے؟ اور آخری بات یہ ہے کہ حضرت مترجم کے ان تصرفات و اضافات یا زیادات ونقصانات کا جواز کیا ہے اور کیوں ہے؟

فارسی ترجمہ کا معیار: عربی متن کے فارسی ترجمۂ شاہ کے بارے میں بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ ان کا ترجمہ عربی متن کا صحیح ترین اور بہترین ترجمہ ہے۔ حضرت شاہؒ نہ صرف ترجمہ کی خداداد صلاحیت لے کر آئے تھے بلکہ دونوں کی ادبیات کے ماہر عالم تھے اور دونوں زبانوں میں سے ایک دوسرے میں ان کو ترجمہ کرنے کا ملکہ خاص حاصل تھا جو بہت سے مترجمین کو حاصل نہیں ہوتا۔ وہ فن ترجمہ سے واقف تھے اور ان کے اصول وقواعد سے بھی جن کو انہوں نے مرتب بھی کیا تھا۔ ان کو فارسی رسالہ رد روافض کا عربی میں اور عربی متن کلام اللہ کا فارسی میں ترجمہ کرنے کا وسیع، بیش بہا، عمیق وعریض اور عظیم الشان تجربہ بھی حاصل تھا۔ ان کے علاوہ دونوں رسالوں کے موضوع، مضمون پر ماہرانہ قدرت رکھتے تھے۔ ان کا اپنا ادبی ذوق بھی بہت معیاری، بلند اور شاندار تھا۔ ان تمام عوامل وعناصر اور اسباب و ملکات نے حضرت شاہؒ کے فارسی ترجمہ کو عربی متن کے ہم پلہ بنا دیا ہے۔ ہر لحاظ سے، صحت کے لحاظ سے، فصاحت و بلاغت کے اعتبار

سے اور ادبیات و فارسیت کے نقطہ نظر سے۔ ان کے ترجمہ کی ایک نادر و نایاب صفت یہ ہے کہ وہ ترجمہ میں متن جیسے الفاظ اور اتنے ہی کلمات لاتے ہیں، تشریحی اضافات کی بات اور ہے، ورنہ ان کے ترجمہ کے الفاظ و کلمات عربی متن سے زیادہ نہیں ہوتے اور اس سے زیادہ اہم صفت یہ ہے کہ عربی جملوں کی ساخت فارسی ترجمہ میں بھی برقرار رکھتے ہیں۔ زبان و لغت کے اعتبار سے ان کی فارسی سلیس ترین اور سہل ترین اور قابل فہم ہوتی ہے، وہ زبان جو عام و خاص سب کی سمجھ میں آجائے عربی متن کی ترتیب الفاظ و کلمات کی وفادارانہ پیروی میں بھی ان کی فارسی کی ادبیت مجروح نہیں ہوتی بلکہ کچھ بڑھ ہی جاتی ہے، سبک ہندی میں انہوں نے ایک خاص سبک ولی اللٰہی کی طرح ڈالی ہے جس کی طرف فارسی ادبیات ہند کے ماہرین نے ابھی تک زیادہ توجہ نہیں کی ہے۔ ان کے فارسی ترجمہ کی زبان اپنے اسلوب خاص میں ان کی طبع زاد فارسی کتب و رسائل سے ذرا نہیں خاصی مختلف ہے۔ ان دونوں کا موازنہ بھی ایک ادبی اعجاز کا پتہ لگانے کے مترادف ہوگا۔ مگر فارسی ترجمہ کی زبان اپنی جگہ ماہرین لسانیات و ادب کو کام کرنے کی دعوت دیتی ہے۔ یہ قطعی نادر اسلوب ہے جسے قرآنی اسلوب کا پرتو کہا جاسکتا ہے۔ خاکسار راقم نے اپنی بساط بھر اور موضوع کی تنگنائے میں فتح الرحمان کے ترجمہ وحواشی کا لسانی تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے مگر وہ ایک مبتدی کا تجزیہ ہے۔ بہرحال اسی سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ عربی متون کی وفادارانہ پیروی میں فارسی ترجمہ خوب سے خوب تر کیونکر کیا جاسکتا ہے۔ اس کے لیے چند مثالیں۔ مختصر ترین انداز میں۔ دونوں متون کی پیش کی جارہی ہیں، ورنہ اصلاً یہ تقابلی مطالعہ متون ایک کامل تحقیقی مقالہ کا مقتضی ہے جو انشاء اللہ جلد ہی پیش کیا جائے گا۔

۱- وارضعته حليمة بنت ابى ذويب السعدية ، وعندها شق صدره ، وملئ حكمة وايمانا ، بعد ان استخرج حظ الشيطان منه

وشیر داد آنحضرت ﷺ حلیمہ بنت ابی ذویب، ونزدیک حلیمہ شگافتند سینۂ آنحضرت ﷺ وپر کردند آنرا بدانش وایمان بعد ازاں کہ بیرون آوردند نصیب شیطان راازیں جا۔

۲- فلما بلغ اربعين سنة ويوماً ابتعثه الله بشيرا ونذيرا ، واتاه جبريل عليه السلام بغار حراء فقال : اقرأ ...... الخ -

وچون عمر شریف بچہل سال و یک روز رسید، خدا تعالیٰ آنحضرت ﷺ فرستاد بہ نبوت وانذار و بشارت، و آمد پیش آنحضرت ﷺ جبریل علیہ السلام در غار حراء پس گفت، اقرأ یعنی ''بخوان''......الخ۔

۳- وحج عليه السلام بعد فرض الحج حجة واحدة ، وقبل ذلك مرتين فيما قيل ، وخرج فی حجة الوداع نهارا بعد ان ترجل وادهن وتطيب ، فبات بذی الحليفة ...... الخ -

وحج گزاردند آنحضرت ﷺ بعد ازانکہ حج فرض شد یکبار، وقبل ازاں دوبار حج گزاردہ بودند۔ و بیرون آمدند از خانہ خود در حجۃ الوداع [در روز دوشنبہ] بعد ازانکہ شانہ کردند و روغن و خوشبوی در بدن مالیدند، پس فرود آمدند بذی الحلیفہ و آنجا شب گذرانیدند......الخ۔

۴- ......كان ربعة بعيد ما بين المنكبين ، ابيض اللون ، مشربا الحمرة ، يبلغ شعره شحمة اذنيه ......

بودند آنحضرت ﷺ میانہ قد، سفید رنگ آمیختہ بسرخی، درمیان ہر دو شانہ آنحضرت ﷺ قدری بعد بود، موی آنحضرت ﷺ میرسیدند بزمۂ گوش......۔

۵- ولقصه علیؓ فلم يخرج منه شئ فقال : ﷺ طبت حيا و ميتا -

وعلیؓ دست بر شکم آنحضرت نہاد پس چیزی بیرون نیامد، گفت: ...... درود خدا برتو پاکیزہ درحال حیات و موت''۔

اضافات (زیادتِ) شاہ: اپنے مختصر مقدمے میں حضرت شاہؒ نے جس ''زیادت'' کا ذکر فرمایا ہے اس کی دو نوعیتیں ہیں: ایک تشریحی زیادت ہے جس کے بعض نمونے عربی متن اور فارسی ترجمہ کے ضمن میں نظر آ چکے ہیں۔ ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرتے وقت ایسے تشریحی اضافے کرنے پڑتے ہیں جن سے متن اصلی کی صحیح ترجمانی و ترسیل کی جاسکے۔ اس کو دونوں زبانوں کے مزاج کی عدم موافقت یا ان کے اختلاف سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ یہ ہر زبان میں ہوتا ہے۔ عربی زبان میں اس کا زیادہ عنصر ہوتا ہے۔ اس کے الفاظ اور کلمات میں ایک جہان معنی بسا ہوتا ہے جسے ترجمہ کا ایک یا دو لفظ ادا نہیں کر سکتے۔ لہٰذا ان کی تعبیر و تشریح کرنے

کے لیے مزید زیادت سے کام لینا پڑتا ہے۔ جیسے اوپر کی مثال-۳ میں اصل الفاظ ہیں: ترجل وادھن وتطیب، حضرت شاہؒ نے ان کے ترجمہ میں لکھا ہے ''شانہ کردند وروغن وخوشبوی در بدن مالیدند''۔ اس میں تشریح کے لیے ''در بدن'' کی زیادت ترسیل معنی کے لیے کرنی پڑی۔ اسی طرح اولین مثال میں عربی میں لکھا ہے کہ شق صدر کیا گیا، حضرت شاہؒ کو یہاں صحیح معنی کی ترسیل کرنے کے مجہول صیغہ کو معروف میں بدلنا پڑا اور ''شگافتند'' کا فصل لاکر اشارہ کرنا پڑا کہ یہ کار فرشتگان تھا۔ ایسی بعض اور مثالیں بھی ہیں۔

حضرت شاہؒ نے دوسری قسم کی ''زیادت خیر'' یہ فرمائی ہے کہ رسول اکرم ﷺ کے لیے ہمیشہ فعل جمع لائے ہیں کہ مشرقی مزاج فعل واحد کو آنحضرت ﷺ کے شایان شان نہیں سمجھ سکتا، وہ مقام مصطفیٰ ﷺ کے لیے عقیدت کا صیغہ لانے پر مجبور ہے لہذا حضرت شاہؒ نے رسول اکرم ﷺ کے لیے ہمیشہ فرودند، بودند، گفتند وغیرہ استعمال کیا ہے جبکہ عربی میں ان کا اصل واحد قال، کان وغیرہ ہوتا ہے۔

- اسی طرح رسول اکرم ﷺ کے لیے بالعموم جہاں بھی متن میں ضمیر آئی ہے حضرت شاہؒ نے ترسیل معنی کے لیے تشریح و وضاحت کے لیے بھی اور عظمت و احترام کی خاطر بھی بیشتر مقامات پر ''آنحضرت ﷺ'' ہی لکھا ہے۔

- جن مقامات پر ضمیر رضمائر کے مرجع رمراجع کی تفہیم میں شک وشبہ پیدا ہو جانے کا امکان تھا وہاں اسم واضح کر دیا ہے جیسے حضرت خدیجہؓ کے سامان تجارت کے لیے ''لھا'' کی جگہ حضرت خدیجہؓ لکھا ہے۔

اضافی معلومات: زیادت کی دوسری نوعیت متن پر اضافہ کے ضمن میں آتی ہے۔ متن نور العیون میں وہ چیز موجود نہیں ہوتی اور ان کے کسی بیان، کلمہ یا روایت کی وضاحت وتشریح کے لیے حضرت شاہؒ اپنی طرف سے متن پر اضافے فرماتے ہیں۔ یہ اضافی معلومات ہیں یا سچ مچ کی زیادات۔ ان میں بھی مختلف نوعیتیں ملتی ہیں۔

- جغرافیائی معلومات: متن میں کوئی مقام ایسا آتا ہے جس کے بارے میں حضرت شاہؒ کو خیال ہوتا ہے کہ شاید قاری اس کے جغرافیائی مقام کو نہ سمجھ سکے تو وہاں وہ اپنی طرف سے

ایک فقرہ یا جملہ بڑھا دیتے یا اس کی مدینہ سے مسافت بتا دیتے ہیں، جیسے نمرہ کو وادی عرفات بتایا ہے، سقایہ کی تعریف ذخیرۂ آب سے کی ہے، خیف کے معنی نشیبی زمین کے بتائے ہیں۔

- کسی روایت متن میں کچھ کمی پاتے ہیں تو اس میں ایک فقرے یا جملے کے اضافے سے اس کو دور کر دیتے ہیں اور قاری کو اس کی صحیح اور ضروری تفہیم ہو جاتی ہے جیسے بحیرا راہب کی پیشگوئی اور یہود کے قتل کر دینے کے خدشے کو سن کر ابو طالب ہاشمی نے متن کے مطابق رسول اکرم ﷺ کو واپس بھیج دیا تھا، حضرت شاہؒ نے برمحل زیادت فرمادی ہے کہ مکہ واپس بھیج دیا تھا۔

- معراج واسراء کے بیان میں متن صرف ''المقام'' سے روانگی کا ذکر کرتا ہے حضرت شاہؒ نے مقام ابراہیم کہہ کر وضاحت فرمادی ہے۔ اسی میں متن صرف نماز کی فرضیت کی بات کرتا ہے، حضرت شاہؒ نے پنج گانہ کی صراحت کر کے ایک اہم مسئلہ کو حل کر دیا ہے۔ فرضیت نماز کے بارے میں جمہور علماء کا اتفاق واجماع ہے کہ وہ قرآن مجید کی تنزیل کے معاً بعد ہوگئی تھی اور شروع میں صرف ایک وقتہ/دو وقتہ تھی۔ پنج وقتہ معراج میں فرض ہوئی۔

- نجبائے نبوی میں حضرت عثمانؓ کا ذکر نہیں کرتا حضرت شاہ نے اسماء کی جگہ خلفائے اربعہ لکھ کر اس کی تلافی کر دی ہے۔

- حجۃ الوداع میں خانہ مبارک سے باہر تشریف کے دن کا ذکر متن میں نہیں ہے حضرت شاہؒ نے روز دوشنبہ بڑھا دیا ہے۔

- اسی فصل میں ''عمرۃ فی حجۃ'' کی نیت کی تشریح فرمادی ہے کہ حاصل معنی اس کلمہ کا یہ ہے کہ آپ ﷺ کو حج وعمرہ دونوں کی نیت کرنے کا حکم دیا گیا جسے فقہ میں قِران کہتے ہیں لہذا حضرت رسول اکرم ﷺ نے ان دونوں کا احرام باندھا تھا۔ متن میں صرف یوم الترویہ ہے حضرت شاہؒ نے اس کی تاریخ متعینہ ۸/ذوالحجہ بڑھا دی ہے۔

ایسے تشریحی اضافات بہت ہیں اور ان سب کو جمع کیا جائے تو متن کا ایک خاص ضمیمہ تیار ہو جائے گا۔

نقص شاہؒ: مختصر مقدمہ میں حضرت شاہؒ نے ضعیف روایات کا ذکر کر کے اشارہ دیا ہے کہ ان کے خیال میں جو ایسی روایات تھیں ان کو متن سے ساقط کر دیا ہے۔ ایسی متعدد روایات

متن کا سراغ ملتا ہے۔ اس میں بلاشبہ ضعیف بھی ہیں لیکن کچھ اور بھی ہیں جو ان کے "تبدیل و تصرف" کے ضمن میں آتی ہیں۔ ان کا ذکر اسی باب میں کرنا مناسب رہے گا۔ ضعیف روایات کی تنسیخ رنقص شاہؒ کے چند نمونے درج ذیل ہیں:

- نور العیون میں اپنے ماخذ خلاصۃ السیر کی یہ روایت لے لی ہے کہ رسول اکرم ﷺ جس وقت رحم مادر میں تشریف فرما ہوئے اس وقت والدہ ماجدہ بی بی آمنہ ایام تشریق میں جمرۂ وسطیٰ کے پاس قیام پذیر تھیں۔ حضرت شاہؒ نے اپنے ترجمہ میں اس روایت کو ساقط کر دیا ہے۔

- تمام کتب سیرت میں یہ ذکر ملتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ کے بعض صحابہ کرامؓ جیسے حضرات علی بن ابی طالبؓ اور زبیر بن عوامؓ وغیرہ مجرموں کی گردنیں مارتے تھے۔ حضرت شاہؒ نے اس کو غالباً ضعیف سمجھا اور اپنے ترجمہ سے ساقط کر دیا۔ ممکن ہے کہ اس فصل کو اس لیے ساقط کیا ہے کہ وہ سوئے ادب کی حامل ہے۔

- ایک بہت دلچسپ نقص کی مثال یہ ہے کہ متن نور العیون کی فصل عشرہ مبشرہ میں حضرت بلالؓ کا نام نامی نہ جانے کیسے آگیا ہے۔ وہ کاتب کی غلطی بھی ہوسکتی ہے لیکن لگتی نہیں ہے۔ بہر حال حضرت شاہؒ نے اس گیارہویں شخصیت کو عشرہ مبشرہ سے کم کر دیا ہے۔

تبدیل وتصرف شاہؒ: اصلاح متن کے ضمن میں حضرت شاہؒ نے ایک خانہ تبدیل وتصرف کا بھی قائم کیا ہے۔ چنانچہ وہ اس کے تحت نور العیون کی کئی بلکہ بہت سی روایات کو اپنے ترجمہ فارسی سرور المحزون میں نہیں لیتے۔ حالانکہ وہ ضعیف رموضوع روایات نہیں بلکہ سچی پکی اور صحیح احادیث و روایات ہیں۔ ان کے اخراج کا سبب صرف تبدیل وتصرف شاہ کا طریقہ ہے اگرچہ اس کا اصول وتوجیہ وہ بیان نہیں فرماتے۔ تنقید نگار اور قاری دونوں کے لیے اس کی توجیہ کرنی آسان نہیں ہے، بس یہی کہا جاسکتا ہے کہ وہ اسی "تبدیل وتصرف شاہؒ" کا نتیجہ ہیں۔ ان میں سے بعض بہت اہم احادیث وروایات کا ذکر کیا جاتا ہے:

- حضرت خدیجہؓ سے رسول اکرم ﷺ کی شادی کے بعد متن میں ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ان کو بارہ اوقیہ سونا مہر میں دیا تھا اور دوسری روایت ہے کہ وہ رسول اکرم ﷺ پر ایمان لانے والی اولین شخصیت تھیں۔ حضرت شاہ نے ان دونوں کو ساقط کر دیا ہے۔

- امام ابن سید الناس نے نور العیون میں رسول اکرم ﷺ کی وفات وغیرہ کے بارے میں بعض اختلافی تاریخوں کا صرف حوالہ دے کر اپنی کتاب سیرت عیون الاثر میں ان کی تفصیل بیان کرنے کا ذکر کیا ہے، حضرت شاہؒ نے عیون الاثر میں تصرف فرما کر وہاں ''کتب مطولہ'' رکھ دیا ہے۔ یہ جامع فصل سیرت مکی کا آخری جملہ ہے۔

- فضائل و اخلاق نبویؐ کے بیان / فصل میں امام ابن سید الناس نے پانی / مشروب پینے کی دو سنتیں لکھی ہیں: ایک یہ بالعموم آپ ﷺ بیٹھ کر پانی / مشروب فرماتے تھے اور کبھی کبھی آپ ﷺ نے کھڑے کھڑے بھی اسے نوش فرمایا ہے۔ حضرت شاہ نے اپنے ترجمہ میں دوسری حدیث / سنت: وربما شرب قائماً میں تصرف فرما کر اسے خارج کر دیا ہے۔

- مزاج نبوی کے تینوں واقعات متن میں تین خواتین سے متعلق ہیں حضرت شاہ نے اولین واقعہ - اونٹنی کا بچہ - دینے کو ایک مرد شریف سے متعلق فرما دیا ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ ترمذی میں وہ ایک مرد کے بارے میں ہی ہے۔

- تمام ازواج مطہراتؓ اور متعدد دوسرے حضرات و خواتین کے مفصل نسب کو حضرت شاہ نے ہر جگہ ساقط فرما دیا ہے۔ حضرت شاہ کے ایسے تصرفات اور تبدیلیوں کی تعداد بھی خاصی ہے۔ ان پر بحث آخری تجزیاتی تبصرہ میں آتی ہے۔

ضروری اضافات / زیادات کا فقدان: حضرت شاہؒ نے اپنی بساط بھر متن نور العیون کی معلومات طلب کمیوں کو اپنے اضافات و زیادات کے ذریعہ پُر کرنے کی کوشش کی ہے تاہم متعدد مقامات پر وہ ضروری معلومات کا اضافہ / زیادت کرنے سے چوک بھی گئے ہیں اور یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں ہے۔ انسانی مساعی کی ایسی ہی تقصیرات دیکھ کر امام مزنیؒ / شافعیؒ نے فرمایا تھا کہ ستر بار بھی کتاب کو پڑھا جائے تو کوئی نہ کوئی غلطی ضرور رہ جاتی ہے اور وہ مل ہی جاتی ہے۔ یہ تو صرف کتاب اللہ کا مقام و مرتبہ ہے کہ وہ تقصیر سے پاک ہے خوردہ گیری سے تو بہت سی تقصیرات شاہ کا پتہ چلایا جا سکتا ہے مگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو چند بہر حال قابل ذکر ہیں:

- متن نور العیون میں رسول اکرم ﷺ کی جائے پیدائش - مکہ مکرمہ - کا ذکر رہ گیا ہے، حضرت شاہ بھی اس کا اضافہ کرنے سے چوک گئے۔ جبکہ دونوں کا بنیادی ماخذ خلاصۃ السیر میں

موجود ہے۔

- ایک بڑی چوک امام سید الناس اور حضرت شاہ دونوں سے یہ ہوئی ہے کہ مزدلفہ میں مغرب وعشاء کی باجماعت نماز ایک اذان اور دو اقامتوں کے ساتھ ادائیگی کا ذکر حجۃ الوداع میں رہ گیا ہے۔ حضرت شاہ کو اس کا بہرحال اضافہ کرنا چاہیے تھا۔

اغلاطِ متن کی تصحیح: متن نور العیون میں متعدد اغلاط راہ پا گئی ہیں۔ حضرت شاہؒ نے ان کی تصحیح نہیں کی اور جوں کا توں رہنے دیا ہے۔ ان میں سب سے اہم وہ ضعیف روایات ہیں جو ولادت نبوی کے وقت کے معجزات وآیات کے ظہور کے بارے میں ہیں یا ہجرت کے وقت کے معجزہ غار ثور سے متعلق ہیں جیسے مکڑی کا جالا بننا وغیرہ یا آپ ﷺ کے بہت سے معجزات کے بارے میں روایات فصل معجزات میں آئی ہیں۔ (سید سلیمان، سیرۃ النبیؐ، اعظم گڈھ، ۳)

- بعض واقعاتی اغلاط ہیں جیسے محاصرہ شعب ابی طالب میں متن، رسول اکرم ﷺ کے ساتھ آپ کے اہل بیت کی محصوری کی بات کرتا ہے جبکہ اہل بیت کی جگہ بنو ہاشم و بنو مطلب ہونا چاہیے۔

- اسی طرح رسول اکرم ﷺ کی زرہوں میں زرہ داودی کی شمولیت کی روایت ہے۔ حضرت شاہؒ نے اس پر استدراک نہیں فرمایا۔

تجزیاتی تبصرہ: حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا فارسی ترجمۂ نور العیون - سرور المحزون - ایک عظیم عبقری کا کارتالیف ہے، حضرت مترجم صرف مترجم نہ تھے، قرآن وحدیث کے علوم کے امام، حدیث وفقہ کے ماہر اور سیرت وتاریخ وغیرہ کے جلیل القدر پارکھ تھے۔ اسلامی علوم وفنون پر ان کو تبحرانہ قدرت حاصل تھی۔ لہذا وہ صرف ترجمہ تک محدود رہ نہیں سکتے تھے۔ ان کا تبحر علمی، استدراک فنی اور تصنیف وتالیف کا طویل تجربہ ان کو مجبور کرتا تھا کہ وہ اپنے زیر تالیف ہر کام پر ناقدانہ نظر ڈالیں اور اسی کا نتیجہ ہے کہ حضرت شاہؒ کا رسالہ سیرت سرور المحزون ایک عربی مختصر سیرت کا ترجمہ ہوتے ہوئے بھی طبع زاد رسالہ ہے۔

تاہم وہ ایک انسانی کاوش ہے اور ہر انسانی کاوش کسی نہ کسی جہت سے ناقص ضرور ہو جاتی ہے۔ سرور المحزون پر جتنے تنقیدی اعتراضات کیے جاسکتے ہیں اس سے زیادہ اس کے اصل ماخذ و متن نور العیون پر کیے جاسکتے ہیں۔ اسی طرح نقص کے ساتھ کمال کا عنصر بھی لگا ہوتا

ہے اور حضرت شاہ تو صاحب کمالات ہیں اور ان کے اعلام اس ترجمہ میں بھی موجود ہیں۔تنقیدی مطالعات کے دراصل دو پہلو یا جہات ہوتی ہیں: نقائص اور فروگذاشتوں پر نقد واستدراک اور امتیازات وکمالات کی تحسین۔ ہمارے اس تنقیدی مطالعہ میں یہ دونوں جہات موجود ہیں۔

اپنے مقدمہ میں حضرت شاہؒ نے زیادت ونقص اور تبدیل وتصرف میں ضعیف روایات کا خاص ذکر فرمایا ہے۔متاخرین علماء کرام نے بھی اسی پر زیادہ زور دیا ہے کہ حضرت شاہؒ نے امام ابن سید الناس کی ضعیف روایات کو بدل کر صحیح روایات رکھ دی ہیں بلاشبہ بعض مقامات پر انہوں نے بعض ضعیف روایات کو نکالا ہے لیکن نور العیون کی دیگر ضعیف بلکہ موضوع روایات جوں کی توں ان کے ترجمہ میں چلی آئی ہیں اور ان کی تعداد اخراج شدہ سے کہیں زیادہ ہے۔ان کا مفصل ذکر پہلے آچکا ہے۔لہذا یہاں صرف اشارہ کیا جاتا ہے وہ زیادہ تر معجزات وآیات وبشارات سے متعلق ہیں جیسے شب ولادت کے معجزات، بحیرا راہب اور دوسرے راہب کی بشارات، ایسے ہی وفات نبوی کے وقت کی بعض روایات جن میں ابلیس اور خضر علیہ السلام کی نداؤں وغیرہ کی روایات شامل ہیں۔ان کا قبول کرنا حیرت ناک ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شاہؒ ان کے ضعف کو جاننے کے باوجود ان کی تخریج کی ہمت کر سکے نہ ان کے اخراج کی۔غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسی بہت سی ضعیف روایات ان کی کتاب حجۃ کے باب سیرت میں موجود ہیں۔بوقت ولادت نور کا ظہور، کاہنوں اور منجموں کی خبریں، برکات کا ظہور، راہبوں کی بشارت وغیرہ اس میں بھی موجود ہیں۔ان کا یہ باب سیرت معجزاتی زیادہ ہے اور واقعاتی ذرا کم ہے۔(حجۃ اللہ البالغہ، مکتبہ سلفیہ طباعت ۲/۲۰۵-۲۰۶ و مابعد؛ شاہ ولی اللہ کا فلسفہ سیرت، علی گڑھ، ۲۰۰۰ء)

سب سے زیادہ حیرت ناک بات یہ ہے کہ حضرت شاہ نے امام ابن سید الناس کی مرجوح روایات قبول کرلیں اور ان پر نقد واستدراک نہیں فرمایا۔ان کے اپنے اصول کے مطابق انہیں ساقط کرنا تھا، نقص نہیں فرما سکتے تھے تو ان پر استدراک کرنا ضرور تھا، وفات والدہ ماجدہ کے وقت عمر شریف کی راجح روایت چھوڑ کر مجروح روایت قبول فرمالی یا غزوات کی تعداد کی مرجوح روایت بیان کی، ایسی مرجوح روایات کی تعداد اچھی خاصی ہے۔

بعض بہت اہم مقامات پر متن نور العیون کے مولف گرامی سے چوک ہوگئی اور بہت

اہم روایات ساقط ہوگئیں، حضرت شاہ نے ان مقامات پر اضافات فرمائے نہ استدراکات جیسے حجۃ الوداع میں مزدلفہ میں مغربین کی ادائیگی کی حقیقت حیرت انگیز بات یہ کہ زبردست غلطی محبّ طبری کی خلاصۃ السیر میں پائی جاتی ہے، کیا یہ سمجھا جائے کہ یہ اسی کا اثر بد ہے؟

نقص کرنے میں حضرت شاہ نے بہت چیزیں شامل کرلی ہیں۔ ان سے اختصار تو پیدا ہوا ہے مگر بعض ضروری اور مفید معلومات بھی رہ گئی ہیں۔ ان میں افراد وشخصیات کے نسب نامے خاصے اہم ہیں۔ ازواج مطہرات کے پورے انساب سے ان کے خاندانوں اور قبیلوں کے بارے میں مفید معلومات ملتی ہیں۔ اسمائے نبوی کے ضمن میں ''نبی الملحمہ'' کے لیے صحیح مسلم کا ساقط کرنا سمجھ میں نہیں آتا، رسول اکرم ﷺ کی صحیح حدیث کہ آپ کبھی کبھی کھڑے کھڑے پانی رمشروب پی لیتے تھے کو ساقط فرمانا ناقابل فہم ہے۔ ایسی ہی اور چیزیں ہیں۔ یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کسی مترجم کو اپنے متن سے معلومات وروایات ساقط کرنے کا حق کب پہنچتا ہے؟۔

اسی ضمن میں بعض اضافات شاہ کا ذکر کردینا چاہیے جو غیر ضروری تو نہیں لیکن سیاق و سباق میں عجیب لگتے ہیں۔ حضرت شاہ نے حضرات عمر فاروقؓ، عثمان غنیؓ اور علی مرتضیٰؓ کے لیے عہد نبوی کے واقعات کے ضمن میں ''امیر المومنین'' کا لقب نہ جانے کس مصلحت سے بڑھایا ہے۔ ان کے ادوار خلافت کے لحاظ سے تو بہت مناسب لگتا ہے مگر حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالبؓ نے حضرت فاطمہؓ بنت رسول اکرم ﷺ اور امیر المومنین عثمانؓ نے حضرت رقیہؓ اور ان کے بعد حضرت ام کلثومؓ سے شادی کی یہ عجیب لگتا ہے، اسی طرح رسول اکرم ﷺ کے فقر وفاقہ کے بیان میں کہ آپ ﷺ ''مال بیت المال'' سے صرف ضروری اور ادنی چیزیں لیتے تھے مناسب نہیں لگتا یہ بعد کے ''اداروں'' کا عہد نبویؐ میں حوالہ دینا تاریخی تبحر کے خلاف ہے۔ اسی طرح مازن بن عضویہ اور قارب بن سواد کے قصوں کا اضافہ بھی کوئی اچھا اضافہ نہیں ہے، وہ خاصی ضعیف روایات ہیں۔

بایں ہمہ سرور المحزون میں حضرت شاہ کے اضافات و کرامات بھی ہیں جو ان کی عبقریت اور دیانت اجاگر کرتے ہیں۔ ان پر تفصیل سے کلام آچکا ہے، یہاں صرف نکات کی شکل میں ان کو بیان کیا جاتا ہے تاکہ بیک نظر امتیازات دکھائی دیں:

۱- حضرت شاہ کا فارسی ترجمہ انتہائی سلیس، سادہ مگر اسی کے ساتھ بہت خوبصورت اور

فصیح و بلیغ ہے۔ عربی متن سے وہ فصاحت و بلاغت اور معیار و انداز میں کسی طرح کم نہیں، حضرت شاہؒ نے عربی اسلوب کی کلامی ترتیب کی پیروی کرکے ایک نئی طرح ڈالی ہے جو غالباً ان ہی پر ختم ہوگئی۔ بعض بہت خوبصورت ترجمے کیے ہیں، نئے معنی خیز کلمات وفقرے لائے ہیں اور بعض انتہائی خوبصورت اور جلیل القدر تعبیرات وتشریحات پیش کی ہیں۔ قریش کی مخالفت کے لیے ''فرط بے دانشی'' کا فقرہ لانا کمال کی بات ہے۔

۲- رسول اکرم ﷺ اور صحابہ کرام کے لیے تکریمی صیغے اور ادب واحترام کے القاب استعمال کرنا حضرت شاہ کا اہم کمال ہے۔ وہ سید المرسلین ﷺ کے مقام رفعت اور خیر امت کی شان عظمت کے شایاں تو ہے ہی مشرقی مزاج کی رعایت اور دینی جذبہ کی تسکین بھی فراہم کرتا ہے۔

۳- ان کے ایک دو لفظ پر مبنی تشریحی اضافات ہوں یا وہ فقروں وجملوں پر مشتمل ہوں زبردست معنی آفرینی کرتے ہیں۔ وہ متن کے خلاؤں کو پر کرتے، قارئین کو صحیح سنن وواقعات سے آگاہ کرتے اور علمی تقاضوں اور تحقیقی مطالبوں کی تسکین کرتے ہیں جیسے مقام ابراہیم، نماز پنج گانہ، روز دوشنبہ۔

۴- ان کے متعدد جغرافیائی معلومات پر مبنی اضافات وزیادات بھی ایک آدھ فقرے میں بڑی معلومات دے جاتے ہیں۔

۵- حضرت شاہؒ نے ان اضافات وزیادات کے لیے یقیناً دوسری کتب سیرت استعمال کی ہیں جن میں خود امام ابن سید الناس کی کتاب مفصل عیون الاثر بھی شامل ہے اور ان کے علاوہ حدیث میں شمائل ترمذی وغیرہ سے بھی استفادہ کیا ہے مگر بنیادی ماخذ محبّ طبری کی خلاصۃ السیر ہی ہے۔ اس پر بحث کی جاچکی ہے۔

ان امتیازات واضافات وکمالات کی بنا پر حضرت شاہؒ کا فارسی ترجمہ خالص ترجمہ نہیں رہ جاتا۔ جس طرح وہ بعض روایات کو ساقط کرنے کے سبب خلاصہ بھی نہیں بن جاتا۔ وہ ان کا ایک طبع زاد رسالہ سیرت بن جاتا ہے جو نور العیون - یعنی اپنے اصل متن - سے ہر طرح سے بڑھ جاتا ہے۔ اگر متاخرین اس کو بطور ایک ماخذ سیرت اور بطور ایک کتاب حوالہ بیان کرتے ہیں تو بے جا نہیں کرتے۔ وہ کمیت وکیفیت دونوں میں نور العیون سے افضل وبہتر رسالۂ سیرت ہے۔

اودھ کی ثقافت، فلسفہ اور ادب - ماضی قریب تک

ڈاکٹر سید عبدالباری

مشرقی یوپی کا وہ علاقہ اودھ کہلاتا ہے جہاں اودھی زبان بولی جاتی رہی ہے اور جس کے ادبی تہذیبی اور روحانی محور کی حیثیت اجودھیا شہر کو حاصل رہی ہے جو زمانہ قدیم میں اپنے مثالی اخلاق و کردار رکھنے والے پیشوا شری رام چندر جی کا دارالسلطنت تھا اور جن کی بلند شخصیت اور اخلاقی و روحانی تعلیمات کی شعاعیں مدت دراز تک اس سرزمین سے پھوٹتی رہی اور ملک کے مختلف گوشوں میں تاریخ ہند کے مختلف ادوار میں پھیلتی رہی ہیں۔ چنانچہ اس سرزمین نے اپنی انسان دوستی اور حق پرستی کی بنا پر گیارہویں صدی عیسوی میں اسلام کے علم برداروں کا استقبال کیا اور دھیرے دھیرے التمش کے دور میں اسے مدینۃ الاول کا درجہ حاصل ہوگیا۔ یوں تو ہندوستان میں آریوں کی آمد کے بعد شمالی ہند کا یہ علاقہ جو لکھنؤ سے بنارس اور الٰہ آباد سے نیپال کی ترائی تک پھیلا ہوا ہے تہذیب و تمدن کا نقطہ ارتکاز رہا ہے، عظیم ویدوں کی تعلیمات اسی خطہ میں گونجیں اور ہندوستان کی سرزمین سے توحید کا پیغام پہلی بار ویدوں کی زبان سے دنیا نے سنا۔

خدا لامتناہی ہے۔ وہ علم کل ہے، وہ تمام اشیاء کو حالت لطیف سے حالت کثیف میں لانے والا ہے۔ وہی قابل پرستش ہے۔ سورج، چاند، زمین، ستارے جو کہ آکاش میں قائم ہیں اس کی ہستی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ وہ اپنی قدرت سے ان سب پر حاوی ہے۔ وہ تمام کائنات کا خالق ہے۔ پرورش کرنے والا ہے۔ وہ وحدہٗ لاشریک ہے۔ (منتر ۳ و ۴ یجروید۔ ترجمہ اردو دھرم پال، اسٹیم پریس امرت سر، بحوالہ: اسلام کے علاوہ مذاہب کی ترویج میں اردو کا حصہ، محمد عزیز، ص ۴۷)

اس سرزمین سے ۱۸ اُپنشدوں کی روشن تعلیمات دنیا کو ملیں جن میں معرفت الٰہی (برہم

E/۳۲۔ شاہین باغ، نئی دہلی۔ ۲۵۔

گیان) کی حقیقت واشگاف کی گئی۔ اور انسانی تہذیب کے قافلوں کو آگاہ کیا گیا کہ خدا شناسی اور خود شناسی کے بغیر نجات ممکن نہیں اور جب خودی محو ہو تو ادویت (وحدہٗ لاشریک) ایک برہم (خدا) رہ جاتا ہے۔

اودھ کی سرزمین نے دنیائے انسانیت کو پیغام دیا کہ خدا تک رسائی کے لیے آدمی کو اپنے حق و باطل کے شعور (دویک) کو ترقی پذیر بنانا ہوگا۔ ترک علایق دنیا اور ترک لذات (بیراگ) کے راستے پر چلنا ہوگا اور خواہشات نفس اور محسوسات قلب کو قابو میں کرنا ہوگا۔ صفائے قلب کے حصول کے لیے نیک اعمال و افعال کا راستہ بتایا گیا ہے۔ ایسے لوگوں اور رشیوں کی بڑی تعداد اس سرزمین میں پیدا ہوئی جنہوں نے اپنے بلند اخلاق اور پاکیزہ اعمال اور بے مثال تیاگ اور ایثار و قربانی سے دنیائے انسانیت کے سامنے بلند روحانی و اخلاقی اقدار کے عملی نمونے پیش کیے۔ انہوں نے یوگ اور ضبط نفس کی ایسی مثالیں قائم کیں کہ آج بھی انسانی تاریخ انہیں دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتی ہے۔ پھر جب وہ مثالی انسان جسے مریاداپرشوتم کہا جاتا ہے، وجود میں آیا تو تاریخ انسانی نے دیکھا کہ رام کی شکل میں ایک ایسا قابل قدر راہبر سامنے آگیا جو شرافت، حسن اخلاق، تحمل و بردباری، شجاعت و دلیری، غیرت و حیا، اطاعت و وفاداری کا ایک چلتا پھرتا پیکر تھا۔ رام چندر جی کے بعد اودھ کی تہذیب تاریخ اور زبان و ادب اسی عظیم المرتبت شخصیت کے گرد گردش کرتی ہے۔ بہت سے اہل قلم نے اس کے کردار کی مرقع کشی کی اور ادب کے کچھ لافانی شاہکار وجود میں آئے۔ سنسکرت ادب میں والمیکی رامائن اور ہندی ادب میں تلسی داس جی کی رامائن کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی، شاید ان کے فنی محاسن سے زیادہ انہیں اس لیے بھی مقبولیت ملی کہ ان کا محور و مرکز رام چندر جی کی دلکش شخصیت ہے جس کی ہندوستان کے ہر مذہب و مسلک کے ماننے والوں کے دل پر محبت موجود ہے۔ (افسوس کہ اس عظیم شخصیت کے وقار اور اس کے لیے لوگوں کے دلوں میں احترام کے جذبات کو کچھ نہایت عیار و فتنہ جو لوگوں نے جن کا اس خطہ کی تہذیبی یگانگت سے کوئی تعلق نہیں تھا بابری مسجد کو رام چندر جی کی جائے پیدائش قرار دے کر مجروح کیا اور وہاں مندر کی تعمیر کی خاطر ایک تاریخی مسجد پر ٹوٹ پڑے اور اسے منہدم کر کے صدیوں سے چلے آرہے اتحاد و اتفاق کے چراغوں کو گل کرنے کی مکروہ کوشش کیں)۔

مسلمانوں نے جب ہندوستان میں قدم رکھا تو شروع شروع میں فارسی و عربی زبان لکھنے اور پڑھنے والے علماء و صوفیہ یہاں تشریف لائے۔ ان اہل علم میں سے ایک بڑے حلقے نے شمالی ہند کے دیگر شہروں کے مقابلہ میں اجودھیا اور اس کے گرد و نواح میں قیام کو زیادہ پرکشش محسوس کیا۔ اس شہر میں علماء و صوفیہ کی ایک اچھی خاصی تعداد فروکش ہوئی اور اپنے اخلاق و کردار سے لوگوں کو گرویدہ بنالیا۔ اجودھیا کی تاریخ سے جو لوگ واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ التمش کے عہد سے مغلیہ عہد تک اہل اللہ اور ارباب معنی کا یہ مرکز رہا، چنانچہ بعض سلاطین نے اسے مدینۃ الاولیا کا خطاب دیا۔ اکثر بادشاہوں نے اس شہر میں آکر قیام کیا اور یہاں کے اہل علم و فضل سے فیض حاصل کیا۔ اجودھیا میں مسلمان صوفیہ کی پذیرائی کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ اودھ میں رواداری اور انسان دوستی کی روایت خاصی توانا تھی۔ سلاطین کے عہد اور مغلیہ دور میں ہندو مذہب میں یہ طرز فکر کافی مقبول تھا کہ حقیقت اولی ایک ہے جس کو پانے کے راستے مختلف ہیں۔ اسلام اگرچہ اس طرز فکر کا حامی نہیں تھا لیکن اسلام میں دیگر مذاہب کے احترام کی روایت نہایت تابناک رہی ہے۔ خاص طور پر صوفیہ بندگان خدا سے محبت اور ان کی خیر خواہی میں پیش پیش تھے۔ اس خطہ میں بھگتی تحریک کافی مقبول تھی، اودھ میں رام بھگتی کے سلسلے بھی کافی پھیلے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر تاراچند لکھتے ہیں:

> ''نجات کا ایک راستہ عقیدت اور بھگتی کا راستہ ہے۔ بھگتی کی تعریف مختلف طریقوں پر کی گئی ہے۔ مثلاً ایک شخصی خدا سے شخصی عقیدت رکھنا۔ اس سے ایسی محبت کرنا جیسے ایک انسان سے کی جاتی ہے۔ اس کی خدمت کے لیے ہر شئے کو وقف کردینا اور اس کے ذریعہ موکش حاصل کرنا نہ کہ علم یا قربانی یا اعمال کے ذریعہ''۔

اس تحریک نے مساوات کا پیغام دیا۔ مرشد کی اہمیت و فضیلت کو نمایاں کیا۔ کچھ مسلمان صوفیہ نے بھی اس تحریک سے غیر معمولی دل چسپی لی۔ ہندوؤں کے شانہ بشانہ بہت سے مسلمان اہل قلم نے اودھی زبان میں خدا سے عشق اور مرشد سے رہنمائی حاصل کرنے کا پیغام دیا گو اس طرز فکر کے اسلام سے میل کھانے میں دشواری تھی کہ اسلام خالص عمل پر اور عمل کے ذریعہ خدا

تک رسائی پر زور دیتا ہے۔ کچھ مسلمان صوفیہ نے ہمہ اوست یعنی خدا کا جلوہ ہر شے سے منعکس ہوتا ہے کو محور بنا کر تصوف کے کوچے میں قدم رکھا۔ شیخ محی الدین ابن عربی نے ہندوستان کے صوفیا کے ایک بڑے سلسلے کو متاثر کیا۔ وحدت الوجود کے مرکزی فکر وید اُپنشد اور گیتا کے اندر حقیقت اولیٰ کی جو تشریح کی گئی ہے اور خالق ومخلوق میں جو رشتہ دریافت کیا گیا ہے اس سے کافی قریب ہے۔ چنانچہ اودھ میں وجودی صوفیہ کی خاصی پذیرائی ہوئی۔ جناب سید صباح الدین عبدالرحمان اس کی تشریح میں رقم طراز ہیں:

> ''بندہ اپنے کو فنا کر کے خدا کی ذات میں متحد ہوسکتا ہے اس میں حلول کر سکتا ہے پھر اس کے بعد وہ جو کچھ سنتا ہے تو خدا سے، جو کچھ دیکھتا ہے تو خدا کو، کچھ لیتا ہے تو خدا سے اور کچھ کہتا ہے تو خدا سے۔ اس کو ہر چیز میں خدا ہی خدا نظر آتا ہے۔ اس کی نظر میں خالق خلق، تخلیق اور مخلوق وغیرہ سب ایک ہیں''۔
>
> (ہندوستان میں وحدت الوجود کے مسئلہ سے متعلق بعض غلط فہمیوں کا ازالہ۔ معارف ۱۹۷۰ء، ص ۱۶۵)

ہندوستان میں مسلمان صوفیہ کے پیشوا شیخ علی ہجویریؒ ہیں جن کی ۱۰۷۲ء میں لاہور میں وفات ہوئی، اس مسئلہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''معرفت الٰہی یا برہم گیان یہ ہے کہ بندہ محسوس کرے کہ اس کی تمام حرکات وسکنات خدا کی طرف سے ہیں۔ کسی کو اس کی اجازت کے بغیر اس کے ملک میں تصرف کا محل نہیں۔ ہر شے کی صفت اس کی صفت ہے، متحرک اس سے متحرک ہے اور ساکن اس سے ساکن ہے۔ خواجہ معین الدین چشتیؒ (م ۱۲۲۹ء) نے خیال ظاہر فرمایا کہ عارف یا گیانی عشق الٰہی میں ایسا کھو جاتا ہے کہ اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے اس کی قدرت کاملہ میں محو ومتحیر رہتا ہے۔ ایک قدم بڑھا کر عرش سے حجاب عظمت اور حجاب عظمت سے حجاب اکبر تک پہنچ جاتا ہے مگر اس مقام کے لیے انہوں نے ۱۴ شرطیں معین کی ہیں جن میں حواس خمسہ (اندریوں) پر قابو حاصل کرنا، توبہ وانابت کی صلاحیت کو فروغ دینا شامل ہے۔

حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ فیروز شاہ تغلق کے عہد میں پیدا ہوئے، وفات ۱۳۸۰ میں ہوئی انہوں نے ہمہ اوست کو فنا فی التوحید کی منزل قرار دیا۔ اس منزل میں سالک (یوگی)

کے استغراق کا یہ عالم ہوتا ہے کہ اس کی نظر میں ساری ہستیاں گم ہوجاتی ہیں اور اس سے بالاتر منزل فنافی الفنا کی ہے۔ جہاں سالک اپنی کل کائنات کو دریائے نور میں غرق کردیتا ہے۔ اس کو خدا کے جلال و جمال میں کوئی غرق نظر نہیں آتا نہ اس کی خبر ہوتی ہے کہ کون غرق ہوا۔ یہی وحدت الوجود کا مقام ہے جہاں صرف اللہ ہی اللہ رہ جاتا ہے۔ وجود و عدم، عرش و فرش، اسم و رسم کی تفریق ختم ہوجاتی ہے۔ منشی ولی رام رام ولی جو داراشکوہ کا مشیر خاص تھا اور جس کی وفات ۱۰۴۰ میں ہوئی اس کیفیت کو اس شعر میں بیان کرتا ہے ؂

طبیب و ویدی دارم کہ روز اول شفا عتھا
بسار و مت ولی را ما کہ آخر رام راما ہے

پندرہویں و سولہویں صدی عیسوی میں مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں میں ایسے صوفی سنت پیدا ہوئے جنہوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ حقیقت کا جب کشف ہوجائے تو شریعت کی ضرورت باقی نہیں رہتی اور سالک سماجی بندھنوں اور اخلاقی قدروں سے آزاد ہوجاتا ہے۔ شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ نے ایسے صوفیوں اور سنتوں کو گمراہ قرار دیا ہے لیکن یہ لہر چلتی رہی اور اس کو وحدت الوجود کے فلسفہ کی بھی سرپرستی حاصل رہی۔ مگر مسلمان صوفیہ وحدت الوجود کی تائید کے باوجود شریعت پر زور دیتے رہے۔ اودھ کے عظیم صوفی حضرت اشرف جہاں گیر سمنانیؒ (م ۱۴۰۵ء) اجودھیا کئی بار تشریف لائے جہاں ان کے خلیفہ اعظم شمس الدین اودھی کا جنہیں شاہ سمن فریادرس بھی کہا جاتا ہے مزار ہے، اور خانقاہ کی علامات ابھی تک برقرار ہیں۔ یہ بزرگ بھی وحدت الوجود کے حامی تھے لیکن ان کا خیال تھا کہ اولیاء اللہ کی کوئی بھی قسم فنافی اللہ کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتی جب تک ظاہراً و باطناً، قولاً و فعلاً و حالاً شریعت محمدی کی پابند نہ ہوجائے۔ (لطائف اشرفی، حصہ اول، ص ۲۸، نشاط پریس ٹانڈہ)

لیکن بھگتی تحریک کے اثرات جب عام ہوئے اور مرشد کی اہمیت بڑھنے لگی تو ایسے فقرا بھی سامنے آئے جنہوں نے اپنے مریدوں کو اپنے آگے سجدہ کرنے کی ہدایت کی اس لیے کہ ان کے خیال میں وہ وحدت میں گم ہوکر خود درجہ الوہیت تک پہنچ گئے ہیں۔ بعض صوفیہ حسین و جمیل صورتوں پر وارفتہ ہونا باعث فخر سمجھتے تھے اس لیے کہ حسن و جمال واجب الوجود سے مستعار ہے،

اس لیے دلکش چہروں کی دید رسائی حق کا ذریعہ بنتی ہے، اس طرح مجازی عشق کی حقیقی عشق تک رسائی ایک ناگزیر منزل ہے۔ چنانچہ امرد پرستی کے رجحانات پیدا ہوئے جس کا اثر اردو شاعری پر بھی پڑا۔ دہلی سے اودھ تک عشق مجازی کی یہ بیماری ایک دور میں فقرا میں عام ہوگئی۔ حضرت عبد القدوسؒ گنگوہی (م ۱۵۲۷) نے ایسے فقرا وصوفیا پر سخت اعتراض کیا ہے، انہوں نے رسالہ غرائب الفواد میں خدا اور بندے کے درمیان رشتے کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرمایا:

''اہل شریعت کے نزدیک خداوند تعالیٰ اور عالم کی نسبت وہی ہے جو کاتب حروف اور کلمات کی ہوتی ہے۔ اہل حکمت کے نزدیک یہ نسبت وہی ہے جو تخم کی درخت سے ہوتی ہے لیکن اہل وحدت کے نزدیک یہ نسبت وہی ہے جو سیاہی کی نسبت حروف سے ہے۔ حروف سیاہی سے نکلتے ہیں بلکہ عین سیاہی ہیں لیکن حروف کو سیاہی نہیں کہیں گے''۔ (مکتوبات عبد القدوسؒ گنگوہی، ص ۲۰۵)

شریعت کی پابندی پر زور دینے کے ساتھ ہی ساتھ حضرت گنگوہیؒ اس عہد کے صوفیہ و فقرا اور سنتوں کے بلا تفریق مذہب وملت انسانوں سے محبت اور درد آدمیت کے طرز عمل میں شریک نظر آتے ہیں اور ارشاد فرماتے ہیں:

''یہ کیسا شور ہے اور کیسا غوغا پھیلا ہوا ہے کہ کوئی مومن ہے کوئی کافر ہے۔ کوئی اطاعت کرنے والا ہے کوئی گنہگار ہے، کوئی صحیح راستے پر ہے کوئی غلط پر، کوئی مسلم ہے کوئی پارسا، کوئی ملحد ہے کوئی آتش پرست ہے۔ سب ایک لڑی کے موتی ہیں''۔ (مکتوبات عبد القدوس گنگوہیؒ)

اسی زمانہ میں کبیر داس نے بھی وحدت الوجود کا پرچم بلند کیا اپنے ہم عصر تلسی داس جی کی طرح وہ بھی رامانند کے شاگرد تھے جنہوں نے بھگتی کی تعلیم دی اور ذات پات کی تفریق کو ٹھکرا دیا۔ کبیر نے اپنے اصلاحی جذبہ کے تحت ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو تنقید کا نشانہ بنایا لیکن مذاہب کی بنیادی تعلیمات پر انہوں نے کوئی تنقید نہیں کی۔ کبیر ذات پات، چھوت چھات اور بت پرستی وشرک کے مخالف تھے۔ وہ اوتار واد کے بھی قائل نہ تھے۔ وہ لفظ رام کو خدا کے متبادل کے طور پر استعمال کرتے ہیں ۔

کہے کبیر اک رام جپورے ہندو ترک نہ کوئی
کھالک کھلک کھلک میں کھالک سب گھٹ رہو سمائے

کبیر نے اسلام اور ہندومت کو ایک درخت کی دو شاخوں سے مشابہ قرار دیا ہے اور اپنے خیالات کو ان دو شاخوں کے بیچ سے نکلا ہوا قرار دیا ہے۔ اصل تنبیہ ان کے نزدیک خدا کا حقیقی تعقل ہے۔ (سدھانت دیپکا، کبیر داس، ص۲)

کبیر نے صورت پرستی اور ظاہرداری پر ناپسندیدگی ظاہر کی اور ہندو مسلم اتحاد کی مضبوط بنیاد فراہم کی اور لوگوں کو تلقین کی:

''تم میں وہ لوگ جو مذہب کی حقیقی معنویت اور اس کے منصب کو مانتے اور اس کا اتباع کرتے ہیں ان سب کے بنیادی مقاصد یکساں ہیں۔ تمہارے راستے اتنے مختلف نہیں جتنا تم خیال کرتے ہو اس لیے اصولوں کی پیروی پر متفق ہو جاؤ جو تم سب کو عزیز ہیں''۔ بہ قول اشتیاق حسین قریشی کبیر کے ذریعہ اس خیال کا موثر انداز میں اظہار ہوا کہ ہندومت اور اسلام خدا پر ایمان لانے میں متحد ہو سکتے ہیں اور یہ کہ مذہبی برادری، مذہبی یا مسائل دینیات کی بنا پر تقسیم کی کوئی اہمیت نہیں رکھتی''۔ (برعظیم ہند و پاک کی ملت اسلامیہ مترجمہ ہلال احمد زبیری، ناشر شعبہ تصنیف و تالیف کراچی یونیورسٹی، ۱۹۶۷ء، ص ۱۳۶)

لیکن شریعت محمدیؐ اور منوشاستر پر زور دینے والے دونوں مذاہب کے بزرگوں نے کبیر کی اس کوشش کو قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھا بلکہ دونوں سکندر لودھی کے سامنے مستغیث ہوئے اور سلطان نے کبیر کو مشورہ دیا کہ وہ کسی اور مقام پر چلے جائیں۔ سکندر لودھی نہایت ادب دوست اور علم نواز بادشاہ تھا، وہ خود شاعری کرتا تھا اور گلرخ تخلص تھا۔ اس کے عہد میں کایستھوں نے بالخصوص اودھ کے علاقہ میں فارسی زبان سے گہری دلچسپی لی اور دفاتر میں بڑی تعداد میں ملازم ہوئے۔ جونپور میں ایک فوج کشی کے بعد واپسی پر سکندر لودھی اجودھیا بھی آیا اور یہاں ایک ماہ قیام کیا۔ یہاں کے اہل اللہ سے فیض یاب ہوا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ التمش کے عہد میں اس شہر کو مدینۃ الاولیا کا جو خطاب ملا تھا اس کی معنویت اس وقت تک برقرار تھی۔

مغلیہ عہد میں شیخ محب اللہ الہ آبادی (م ۱۶۴۸ء) نے بھی وحدت الوجود کی زبردست

حمایت کی۔ داراشکوہ ان کا بڑا معتقد تھا، انہوں نے دارا کو نصیحت کی کہ رفاہ عام کے کاموں میں حکام کو تفریق نہیں کرنی چاہیے اس لیے کہ مومن و کافر دونوں خدا کے بندے ہیں۔ (ہندوستان میں وحدت الوجود، معارف ۱۹۷۰ء، ص ۱۷۰)

سترہویں صدی عیسوی میں ہندوستان میں داراشکوہ وحدت ادیان کا سب سے بڑا علمبردار تھا۔ اس نے اپنے رسالہ ''حسنات العارفین'' میں ثابت کیا کہ معرفت توحید کی منازل میں ایک مقام ایسا آتا ہے جہاں سالک تفریق کفر و ایمان خیر و شر اور عبد و معبود سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ دارا رام چندر جی کے اتالیق اور راجہ دشرتھ کے وزیر با تدبیر سے اور خود رام چندر جی سے بہت متاثر تھا۔

غرض اودھ میں عہد وسطی میں رام چندر جی کی اخلاقی تعلیمات جنہیں تلسی داس جی نے تفصیل سے رامائن میں پیش کیا ہے اور اودھ میں مقبول عام بھگتی تحریک اور اودھ کے گوشے گوشے میں موجود درویشوں، صوفیوں اور علماء کی اخلاقی تعلیمات اور مواعظ پر اس خطہ کی تہذیبی بنیاد استوار تھی۔ چنانچہ اودھ میں اس عہد میں فروغ پذیر ادب میں بھی مذاہب کی بنیادی تعلیمات موضوع سخن بنیں۔ عشق الٰہی کی حقیقت، تزکیہ نفس کے معروف طریقے، حقیقت اولیٰ کی معرفت وغیرہ دہلی سے اودھ تک اہل فکر و نظر کا موضوع گفتگو تھے۔ چنانچہ اس عہد کی شاعری میں اس کی واضح جھلک نظر آتی ہے۔ انشا سے آتش تک یہ موضوعات مرکز نظر ہیں۔ اٹھارہویں صدی کے ممتاز شاعر میر تقی میر وحدت الوجود اور ہمہ اوست کے تصورات کو اپنی شاعری کا بار بار موضوع بناتے ہیں۔

گل و آئینہ و خورشید و مہ کیا　　　جدھر دیکھا ادھر تیرا ہی رو تھا

کہے ہے ہر کوئی اللہ میرا　　　عجب نسبت ہے بندے کو خدا سے

عالم آئینہ ہے جس کا وہ مصور بے مثل　　　ہائے کیا صورتیں پردے میں بناتا ہے میاں

لیکن میر کے ذہن پر بھی یہی فکر حاوی ہے کہ سب راستے خدا تک لے جاتے ہیں یعنی کسی ایک کو یہ دعوی کرنے کا جواز نہیں کہ فقط وہی کامل سچائی کا حامل ہے۔

ہوں طریقے مختلف کہتے ہیں منزل ایک ہے

کفر کچھ چاہیے اسلام کی رونق کے لیے حسن زنار ہے تسبیح سلیمانی کا

دارا شکوہ کے مقرب خاص چندر بھان برہمن (م ۱۶۶۲ء) جو اورنگ زیب کے عہد میں شاہی ملازمت سے مستعفی ہوکر بنارس چلے آئے تھے فارسی کے بلند پایہ شاعر تھے اردو میں اس طرح سخن سرا ہیں ۔

پیا کے نام کی سمرن کروں چاہوں کروں کس سے

نہ تسبی ہے نہ سمرن ہے نہ کنٹھی ہے نہ مالا ہے

لالہ ٹیک چند بہار جو سراج الدین علی خاں آرزو کے شاگرد تھے (م ۱۷۵۴ء) وحدت ادیان کا نکتہ یوں بیان کرتے ہیں

وہی اک سماں ہے جس کو ہم تم تار کہتے ہیں

کہیں تسبیح کا رشتہ کہیں زنار کہتے ہیں

راجہ نول رائے وفا جو صفدر جنگ کے زمانہ میں اودھ کے نائب ناظم تھے ایک باکمال سخنور بھی تھے۔ وہ کعبہ و بت خانہ کی تفریق اسی طرح اٹھاتے ہیں ۔

شیخ کچھ فرق ہے تیرے ہی نظر آنے میں ورنہ ہے ایک وہی کعبہ و بت خانہ میں

اپنے ہی چشم کے تئیں تاب نظر نہیں ورنہ وہ آفتاب کہاں جلوہ گر نہیں

اودھ میں برہان الملک فرماں روا ہوئے تو انہوں نے اجودھیا کے نواح میں اپنی چھاؤنی بنائی اور بعد میں شجاع الدولہ کے عہد میں فیض آباد کا بارونق شہر آباد ہوا ۱۷۷۵ تک فیض آباد کو اردو ادب کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ بہو بیگم (شجاع الدولہ کی اہلیہ) چونکہ دہلی کی تھیں اور بڑی فراخ دل اور عالی ظرف خاتون تھیں اس لیے دہلی کی معاشی و سیاسی ابتری کے وقت وہاں سے بڑی تعداد میں ہر طرح کے اہل ہند فیض آباد چلے آئے اور ان کی پذیرائی ہوئی۔ میر حسن نے شجاع الدولہ کے عہد میں اپنی مشہور مثنوی سحر البیان فیض آباد میں لکھی جو اس خطہ کی تہذیب کا دلکش مرقع ہے اور جس میں اس عہد کے راجگان، نوابین اور سر برآوردہ طبقہ کے رہن سہن، نشست و برخواست، جشن و جلوس اور عقاید و توہمات کی سچی تصویر کشی کی گئی ہے۔ بچے کی پیدائش پر پنڈتوں اور نجومیوں سے لوگ اس کی قسمت کے احوال معلوم کرتے ہیں اور جنم پتری

تیار کراتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

کیا پنڈتوں نے جو اپنا بچار تو کچھ انگلیوں پر کیا پھر شمار
جنم پترا شاہ کا دیکھ کر تو لاو برچھک پہ کرکر نظر
کہا رام جی کی ہے تجھ پر دَیا چندرما سا بالک ترا ہوئے گا

یہی میر حسن اپنی مثنوی گلزار ارم میں فیض آباد کی مدح اور لکھنؤ کی ہجو کرتے ہیں اور اپنے عہد کے بزرگوں کے آستانوں سے عوام کی گہری وابستگی کا منظر دکھاتے ہیں۔

ڈفالی واں کھڑی کرتے ہیں چھڑیاں وہ چھڑیاں کیا بھلی لگتی ہیں کھڑیاں
چڑھاتا ریوڑی کوئی کوئی پھول ملیدہ بھی کوئی لاتا بہ معمول
ضلع بولے ہے کوئی کوئی پھکڑ کہیں ٹھٹھا کہیں ہے ڈھول دھپڑ

اس عہد میں بہت سی مثنویاں لکھی گئیں۔ حتی کہ اودھی میں بھی یوسف زلیخا کی داستان نظم کی گئی۔ بعض مثنویوں میں اس عہد کے گھاٹوں اور تیرتھ کے مقامات کا ذکر ہے۔ ہمارے شعرا ایسے مواقع پر گھاٹ پر نہانے والیوں کو خاص طور پر مرکز توجہ بناتے ہیں۔ رنگین کی رنگینی ملاحظہ ہو۔

مٹی کا بنا کوئی سدا شیو کہتی ہے کہ بول بم مہادیو
خوش ہوکے کوئی نہارہی ہے پھولوں کو کوئی بہا رہی ہے

اس عہد کے اردو ادب میں داستانوں، فرضی قصوں اور مثنویوں کے علاوہ مذہبی لٹریچر کا بھی کثرت سے ترجمہ کیا گیا۔ سدا سکھ نثار شاگرد سوداؔ نے ۱۸۲۱ء میں پہلی بار شری مد بھگوت گیتا کو اردو نظم میں پیش کیا اور پانچ ہزار اشعار میں اسے مکمل کیا۔ اس کے بعد متعدد ترجمے مختلف لوگوں نے گیتا کے کیے۔ تلسی داس جی کی رامائن کا اردو میں پہلی بار ۱۸۶۶ء میں ترجمہ ہوا جس کا گارساں دی تاسی نے ذکر کیا ہے اور ڈاکٹر محمد عزیر نے اپنی کتاب ''اسلام کے علاوہ مذاہب کی ترویج میں اردو کا حصہ'' میں اس کا حوالہ دیا ہے۔ رامائن کو اردو نظم کا جامہ پہنانے والے پہلے شاعر منشی شنکر دیال فرحت ہیں جن کی منظوم رامائن پہلی بار ۱۸۸۶ء میں منشی نول کشور کے پریس سے ۱۵۸ صفحات پر شائع ہوئی۔ فرحت کی رامائن سے دھنک توڑنے کا منظر ملاحظہ ہو۔

دھنک کو توڑ کر پھینکا زمیں پر اندھیرا چھا گیا عرش بریں پر

پھڑک اٹھے جنک سیتا ہوئی شاد خوشی سے خانہ خاطر تھا آباد

بہ ہمراہ جلیساں جب آئیں جناب جانکی محفل میں آئیں

(تذکرہ شعرائے ہندو، مرتبہ دیبی پرشاد بشاش، ص ۱۱۱)

اس رامائن کی ادبی حیثیت ممتاز ہے۔ ایک اور منظر جب جانکی جی کو رانی کوشلیا جنگل جانے کے لیے اجازت دینے میں تامل کررہی ہیں، ملاحظہ ہو۔

جناب جانکی جی نے جب سنا حال تو جوش گریہ سے آنکھیں ہوئیں لال

ہوئی آسائش خاطر فراموش اڑا اوج ہوا پر طائر ہوش

حیا نے آکے گو دامن لیا تھام مگر جوش محبت نے کیا کام

خیال آیا کہ ہمراہی میں رہیے صبا بن کر ہوا خواہی میں رہیے

جگن ناتھ خوشتر لکھنوی (م۱۸۶۴ء) نے جو واجد علی شاہ کے دفتر میں متصدی تھے، تلسی داس کی رامائن کو حرف بہ حرف نظم کا جامہ پہنایا۔ ۱۴۸۰۰ اشعار میں انہوں نے دریا کو کوزہ میں بند کیا ہے۔

نگاہ غور سے دیکھیں خردمند کہ دریا میں نے کوزہ میں کیا بند

اس رامائن کی ابتدا حمد سے ہوتی ہے۔

مناسب ہے بشر کی وقت حاجات کرے درگاہ باری میں مناجات

وہی آمرزگار ہر خطا ہے وہی روزی دہ شاہ و گدا ہے

دوارکا پرشاد افق (م۱۹۱۲ء) نے ۱۳سو اشعار پر مشتمل رامائن تحریر کی۔ یہ ۱۹۲۱ء میں شائع ہوئی۔ یہ بالمیک جی کی رامائن کا ترجمہ ہے۔ قصیدہ کے مانند اس کے تمام اشعار ہم قافیہ ہیں۔

بانکے بہاری لال بہار نے بھی رامائن کو اردو نظم کا جامہ پہنایا اور ۱۸۸۶ء میں ان کی رامائن شائع ہوئی۔ منشی سورج نرائن مہر نے بھی رامائن کو اردو نظم کے پیکر میں ڈھالا۔ یہ بھی والمیک جی کی رامائن پر مشتمل ہے۔ والمیک جی نے رام چندر جی کو خدا کا مقام نہیں دیا ہے بلکہ ایک آئیڈیل انسان کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور انصاف و اخلاق میں اعلا قدروں کا مجسمہ قرار دیا ہے جس تصویر کو خراب کرنے کی ۱۹۹۲ء میں آر-ایس-ایس اور وشو ہندو پریشد نے پوری کوشش کی اور اس پیکر حلم کو

ایک خوں خوار انسان بنا کر خود بھی انسانوں کے خون سے اپنے ہاتھ آلودہ کرنے پر کمر بستہ ہوگئے۔

منشی رام سہائے تمنا لکھنوی (م ۱۹۰۰ء) نے کئی قسم کی رامائنیں شعر کے سانچے میں ڈھالیں اور کئی کتابیں تحریر کیں۔ درگا سہائے سرور جہاں آبادی (م ۱۹۱۰ء) نے سیتا جی کی گریہ و زاری کے عنوان سے ایک نظم لکھی۔

مانا کہ دشت میں غم و آرام ہیں بہت　　بن باسیوں کو دکھ سحر و شام ہیں بہت

ایذا اگرچہ آبلہ پائی کی ہے کڑی　　دوزخ سے بڑھ کے آگ جدائی کی ہے کڑی

رائے بیدوناتھ بلی فراقی دریابادی نے بھی والمیکی رامائن کا ترجمہ کیا جو مقبول ہوا۔ بیسویں صدی میں رامائن کے اردو میں منظوم تراجم کا فنی پہلو مستحکم ہے۔ فراقی نے مسدس کی شکل میں واقعات بیان کیے ہے۔ آغاز اس طرح کے اشعار سے ہوا ہے۔

ہے یہ مقام فخر سخنور کے واسطے　　پیدا ہوں حمد خالق برتر کے واسطے

فراقی نرگن سگن دونوں شکلوں میں جلوۂ حق دیکھنے کے قائل ہیں اور مجاز کو حقیقت سے مربوط قرار دیتے ہیں۔

نرگن سگن پہ کیجیے جو غور سے نگاہ　　دونوں ہیں شکلیں حق کی نہیں شبہ و اشتباہ

دو طرح کی ہے معرفت ذات کردگار　　جیسے ہے آگ لکڑی میں مخفی و آشکار

فراقی جب رام چندر جی کی شادی کا منظر بیان کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ ہم اودھ کے کسی خوشحال گھرانے کی شادی کی رسموں میں شامل ہیں۔ شگن، اشگن سعد و نحس پر ہندوؤں، مسلمانوں دونوں کا گہرا اعتقاد تھا۔

کافور دھوپ پان ہیں سب موجب نشاط

اس کو شگون جانتے ہیں سب صاحب نشاط

فراقی جذبات نگاری کے ماہر ہیں۔ رام چندر جی اپنی ماں سے رخصت کے وقت مخاطب ہیں:

اماں مرے لیے یہ تردد یہ انتشار　　میں کیا ہوں مجھ سے لاکھوں پسر آپ پر نثار

تکلیف ہوگی مجھ کو نہ جنگل میں زینہار　　اقبال آپ ہی کا وہاں ہوگا غم گسار

دشمن بھی دوستوں کی طرح پیش آئیں گے
پہلو میں اپنے دل کی طرح سب بٹھائیں گے

پنڈت برج نرائن چکبستؔ کی رامائن کا ایک سین بھی نہایت ہی تاثر انگیز ہے۔ بیسویں صدی میں متعدد ممتاز شعرا نے رام چندر جی کو خراج عقیدت پیش کیا۔ ظفر علی خاں لکھتے ہیں۔

نہ تو ناقوس سے ہے اور نہ یہ اصنام سے ہے — ہند کی گرمی ہنگامہ ترے نام سے ہے
میں ترے شیوۂ تسلیم پہ سر دھنتا ہوں — کہ یہ اک دور کی نسبت تجھے اسلام سے ہے
ہو وہ چھوٹوں کی اطاعت کہ بڑوں کی شفقت — زندہ دونوں کی حقیقت ترے پیغام سے ہے
نقش تہذیب ہنود اب بھی نمایاں ہے اگر — تو وہ سیتا سے ہے چھمن سے ہے اور رام سے ہے

علامہ اقبال رام چندر جی کو یہ نذرانہ سخن پیش کرتے ہیں۔

ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز — اہل نظر سمجھتے ہیں اس کو امام ہند
اعجاز اس چراغ ہدایت سے ہے یہی — روشن تر از سحر ہے زمانہ میں شام ہند
تلوار کا دھنی تھا شجاعت میں فرد تھا — پاکیزگی میں جوش محبت میں فرد تھا

غرض اودھ کی اس ممتاز شخصیت رام چندر جی کی گہری چھاپ ہمیں عہد وسطی سے عصر جدید تک قدم قدم پر نظر آتی ہے۔ اس کے ساتھ اس سرزمین پر آکر حکمت و معرفت کے چراغ روشن کرنے والے اہل اللہ کے تابندہ نقوش یہاں ہزار گردش روزگار کے باوجود اب بھی برقرار ہیں۔ اگر تفصیل بیان کی جائے تو ایک دفتر درکار ہے خاص طور پر گذشتہ تین، چار سو سالوں میں ہندو مذہب اور اسلام کی روحانی و اخلاقی اقدار کے اثرات یہاں کی معاشرتی، تہذیبی اور ادبی زندگی میں نمایاں ہیں۔ خاص طور سے اودھی کے علاوہ اردو زبان میں اسلامی علوم کے ساتھ ساتھ ہندو مذہب کی کتب کے بکثرت تراجم شائع ہوئے۔ کلکی پران کا ترجمہ ۱۸۹۷ء میں لکشمی نرائن پریس مرادآباد سے ۱۸۹۷ء میں شائع ہوا۔ سنسکرت سے اس کا ترجمہ منشی منوہر سروپ ورما نے پنڈت ہر دیال شرما سے کرایا، وشنو پران کا ترجمہ پنڈت امرناتھ مدن ساحر دہلوی نے 1915ء میں شائع کرایا۔ گنیش پران کا منظوم ترجمہ منشی ہر دیال فرحتؔ نے کیا۔ روانی ملاحظہ ہو۔

تھا ہند میں ایک شہر معمور — مشہور زمانہ بستنا پور

حاکم تھا وہاں خجستہ اختر ذی مرتبہ راجہ یدھشٹر
اقبال نے دفعتاً کمی کی ادبار نے شہہ کی ہمدمی کی
آثار خزاں چمن میں آیا خورشید فلک گہن میں آیا

ہندو مذہب کی مشہور کتاب منوسمرتی کا ترجمہ سوامی دیال نے کیا اور نول کشور پریس میں شائع ہوا۔اس کا معاش واخلاق کا باب قابل قدر ہے۔مثلاً

''اعمال نیک سے اور ایسے طریقے سے جس سے بدن کو تکلیف نہ ہو صرف اپنے کھانے بھر کو دولت جمع کرے واسطے حصول معاش کے دروغ گوئی و مضحکہ نہ اختیار کرے۔قناعت کرکے اوقات کو قابو میں لائے کیونکہ خوشی کی بنیاد قناعت اور رنج کی بنیاد بے صبری ہے''۔

اخلاقی کتب میں بھرتری ہری کے اقوال بابو جنگ ہنس رائے نے مرتب کرکے ودیا ساگر پریس علی گڑھ سے ۱۹۰۱ء میں شائع کرائے ،اس کے علاوہ گلدستہ اخلاق اور گلدستہ تہذیب ۱۸۶۹ء میں شائع ہوئیں۔مثنوی اخلاق بند منشی کنہیالال نے ۱۸۷۴ء میں شائع کرائی۔اس مثنوی میں رام چندر جی اور کرشن جی کی مدح سے پہلے حمد کے اشعار اور پھر نعتیہ اشعار بھی ہیں۔اس سے دونوں قوموں کی نظریاتی وتہذیبی ہم آہنگی کا پتہ چلتا ہے۔اسی طرح مہابھارت کے کئی تراجم نثر میں اور ایک منظوم ترجمہ منشی طوطارام شایاں نے کیا جو نول کشور پریس سے ۱۸۹۳ء میں شائع ہوا۔اُپنشد، وید، گیتا کے کچھ تراجم کا ذکر آچکا ہے۔ویدانتی فلسفہ پر اردو میں متعدد کتابیں چھپیں مثلاً بھگتی اور ویدانت مصنفہ سوامی وویکانند ترجمہ شانتی نرائن ، ویدانت کے رتن منشی سورج نرائن مہر دہلوی ، بھگتی پر یوگ وشسٹ کا ترجمہ کنہیالال نے ''الکھ امواج'' کے عنوان سے کیا۔یہ وہ نصیحتیں ہیں جو راجہ دشرتھ کے وزیر بششٹ جی نے بحیثیت اتالیق رام چندر جی کو کی تھیں۔داراشکوہ کے عہد میں ایسے شعرا موجود تھے جو ایک مصرعہ فارسی میں اور ایک اردو میں کہتے تھے۔رام بھگت شعرا کی کثرت تھی۔منشی ولی رام ولی لکھتے ہیں۔

بسا رومت ولی راما کہ آخر رام راما ہے طبیب و ویدمی دارم کہ روز اول شفاعتھا
مروں کو دور مت سمجھو عجب یہ ٹک بہانا ہے شراب سرخ می نوشی اجل کردی فراموشی

دنیائے فانی اور حیات انسانی کے چند روزہ ہونے کا مضمون قدم قدم پر ملتا ہے، مسلمانوں کے ساتھ ہندو شعرا خوب خوب مضمون باندھتے ہیں، لالہ کانجی مل صبا لکھنوی شاگرد

مصحفی سخن سرا ہیں ۔

فنا ہیں ایک دن سب یاں عمارت اور گھر کس کا
یہ دنیا وہم ہے یارو پدر کس کا پسر کس کا
اس خاکداں سے جھاڑ کے دامن کو جوں صبا
ایسا گیا کہ پھر نہ سراغ صبا ملا

منشی بہاری لال مشتاق (م ۱۹۰۴ء) لکھتے ہیں ۔

دیا ہے کعبہ و بت خانہ کا عجب دھوکا　　کسی کو ٹھیک بتاتے نہیں پتہ اپنا
ہیں جب تم ہی پہ شیخ و برہمن مٹے ہوئے　　پھر فرق کیا ہے بت کدہ و خانقاہ میں

غرض گذشتہ صدیوں سے اودھ میں یہ روایت فروغ پذیر رہی کہ ہندو مذہب کی معتبر کتب کے تراجم ہوئے اوران میں اسلامی عقائد واقدار کی جھلک نظر آتی ہے ۔ دونوں مذاہب میں ہم آہنگی کے جوش میں ادویت واد ، وحدت الوجود اور بھگتی کے نظریات وفلسفیانہ خیالات کی اشاعت کی گئی اور اس بات کو بار بار دہرایا گیا کہ سب راستے ایک حقیقت اول تک لے جاتے ہیں اور اس کے عرفان کے بعد شریعتوں کی تفریق ختم ہوجاتی ہے اور مسجد ومندر کا امتیاز باقی نہیں رہتا ۔ لیکن یہ فلسفہ ، مذاہب کی بنیادی تعلیمات کو ختم نہ کرسکا اور بہرحال پوری زندگی کا ایک نظام اور ایک شریعت اور ایک مثالی شخصیت کی تعلیمات کو محور بنانے والے مذہب نے اسے قبول نہ کیا اور خود ہندو مذہب میں شرک اس قدر رچ بس گیا کہ وہ ویدوں کی توحید کی تعلیمات کو صدق دل سے تسلیم نہ کرسکا ۔ اودھی زبان اور اردو کے ادبی شہ پاروں کے مطالعہ سے اس عہد کے فکر وخیال کے نشیب وفراز کا اندازہ ہوتا ہے ۔ کچھ محققین نے بھگتی کال کے ادب اور توحید کی اس عہد میں ضیا پاشیوں کا جائزہ لیا ہے ۔ ابھی اور ضرورت ہے کہ اس کا مزید مطالعہ کیا جائے اور اس کے حسن وقبح پر روشنی ڈالی جائے ۔

احمد لطفی السید کی خودنوشت ''قصۃ حیاتی''
تعارف و تجزیہ

ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی

احمد لطفی السید (۱۸۷۲-۱۹۶۳ء) کا شمار جدید مصر کے معماروں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے ادب، صحافت، سیاست اور تعلیم کے میدانوں میں انتہائی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ وہ مصر میں رائج جدید تعلیمی نظام کے فیض یافتہ اور پروردہ تھے۔ رسمی تعلیم کے علاوہ انہیں شیخ جمال الدین افغانی اور شیخ محمد عبدہ کی صحبت اور تلمذ کا شرف حاصل تھا۔ جس کے باعث وہ ان کے اصلاحی افکار و خیالات سے آگاہ اور ان کی قدر و قیمت کے معترف تھے۔ بیسویں صدی کے نصف اول میں مصر کی جن نمایاں ادبی اور سیاسی شخصیات سے ان کے انتہائی قریبی تعلقات تھے ان میں ڈاکٹر طٰہٰ حسین، قاسم امین، حسین ہیکل اور عبدالعزیز فہمی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

میدان سیاست میں انہوں نے باشندگان ملک کی ہر طرح کی رہنمائی کی۔ چنانچہ ایک طرف انہوں نے عصری تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ''مصر للمصریین'' اور ''سیاسۃ المنافع لا سیاسۃ العواطف'' جیسے عناوین پر طویل فکری مقالات سپرد قلم کیے تو دوسری طرف مصر کی پہلی باضابطہ سیاسی پارٹی ''حزب الامۃ'' کی تشکیل اور قیادت میں کلیدی کردار ادا کیا۔ صحافت کے میدان میں ان کی خدمات کی اہمیت کے اثبات کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ مشہور مصری اخبار ''الجریدۃ'' کے مدیر تھے۔ جو بعد میں ''حزب الامۃ'' کا ترجمان قرار پایا۔ الجریدۃ کے علاوہ بعض دوسرے رسائل میں شائع ہونے والے ان کے طویل مقالات، مصر اور بیرون مصر کے علمی وفکری حلقوں میں بڑے شوق اور دلچسپی سے پڑھے جاتے تھے۔

لکچرر برائے عربی زبان، طبیہ کالج، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

نئی نسل کی تعلیم و تربیت اور ان کی علمی و فکری رہنمائی سے انہیں خاص شغف تھا۔اس مقصد کے تحت انہوں نے بعض قدیم و جدید غیر مسلم فلاسفہ اور مفکرین کی تحریروں کا عربی میں ترجمہ بھی کیا تھا۔وہ قدیم مصری یونیورسٹی کے نصاب اور نظام تعلیم میں بعض بنیادی تبدیلیوں کے حامی اور داعی تھے۔بعد میں جدید مصری یونیورسٹی کے قیام اور نظم و انصرام میں بھی وہ پیش پیش رہے اور کئی مرتبہ اس کی وائس چانسلرشپ کے فرائض بھی انجام دیے۔وہ تعلیم نسواں کے زبردست حامی تھے۔چنانچہ یونیورسٹی میں جب انہیں ذمہ دارانہ مقام حاصل ہوا تو لڑکیوں کی تعلیم کے لیے عملی اقدامات کیے۔کچھ دنوں تک وزارت تعلیم کا قلم دان بھی ان کے پاس رہا۔اس عہد کے تعلیم یافتہ طبقہ پر ان کے غیر معمولی اثرات کی وجہ سے انہیں ''معلم الجیل'' کا لقب دیا گیا۔

کسی بھی شخصیت سے تعارف اور واقفیت کا سب سے مستند ذریعہ وہ تحریریں ہوتی ہیں جو وہ اپنی ذات کے بارے میں اپنے قلم سے حوالہ قرطاس کرتی ہے جسے اصطلاح میں خودنوشت یا آپ بیتی کہا جاتا ہے۔خوش قسمتی سے لطفی السید نے بھی اپنے بارے میں بہت مفید معلومات قلمبند کردی تھیں۔جو بعد میں کتابی شکل میں ''قصۃ حیاتی'' کے نام سے شائع ہوئیں۔ذیل کی سطور میں اسی کتاب کا تعارف اور تجزیہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

احمد لطفی السید نے اپنی خودنوشت سوانح حیات نوے سال کی عمر میں تحریر کی۔اس میں انہوں نے اپنے فکری، سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی افکار و خیالات کی ایک زندہ تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔اس تصویر کشی کے ذریعہ ان کی زندگی کے اہم گوشے ابھر کر سامنے آجاتے ہیں۔انہوں نے اس کتاب میں اپنے ذاتی احوال کے علاوہ بیسویں صدی عیسوی کی ابتداء میں مصر کے عمومی حالت پر خاص طور سے روشنی ڈالتے ہوئے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ سیاست، فکر اور معاشرت کے میدان میں مصر کی تعمیر نو کے لیے ان کی سعی و جدوجہد کی نوعیت کیا تھی اور اس کے بنیادی اصول و مبادی کہاں سے اور کیسے اخذ کیے گئے؟

یہ کتاب مختلف چھوٹے چھوٹے نثری مقالات پر مشتمل ہے۔اور ہر مقالہ ان کی زندگی کے کسی ایک مرحلہ کے بارے میں مکمل اور جامع معلومات فراہم کرتا ہے۔چنانچہ پہلے مقالہ میں انہوں نے اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ مصر کے ضلع ''دسنبلا دین'' کے ایک

گاؤں میں ۱۵؍جولائی ۱۸۷۲ء کو پیدا ہوئے۔ یہ مصر کا انتہائی زرخیز اور مردم خیز ضلع ہے۔ان کے والد ''سید ابوعلی پاشا'' گاؤں کے بااثر لوگوں میں سے تھے۔ وہ اپنی خوبیوں کی بنا پر پورے گاؤں میں عزت واحترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ جب ان کی عمر چار سال ہوئی تو انہیں گاؤں کے ایک مکتب میں داخل کر دیا گیا۔ یہاں انہوں نے قرأت قرآن اور حساب وغیرہ کی تعلیم حاصل کی اور دس سال کی عمر میں قرآن مجید کا حفظ مکمل کرلیا۔اس کے بعد ان کے والد محترم نے انہیں جامعہ ازہر بھیجنے کا ارادہ کیا لیکن اپنے بعض احباب کے مشورے سے ۱۸۸۲ء میں منصورہ کے نرسری اسکول میں داخل کر دیا۔ پورے علاقہ میں یہ واحد اسکول تھا جو براہ راست حکومت کی نگرانی میں چل رہا تھا۔اس سے فراعت کے بعد انہوں نے قاہرہ کے خدیو یہ اسکول میں داخلہ لے لیا جہاں ثانوی تعلیم کے تمام مراحل بحسن وخوبی طے کیے۔اسی اسکول میں ان کی ملاقات عبدالعزیز فہمی سے ہوئی جو تاحیات ایک گہری دوستی اور الفت میں تبدیل ہوگئی (۱)۔اس کالج سے ۱۸۸۹ء میں بی اے (B.A.) کی ڈگری حاصل کر لینے کے بعد انہوں نے قاہرہ کے مدرسۃ الحقوق (Law College) میں داخلہ لے لیا۔ اس کالج میں جدید وقدیم اور عقلی ونقلی دونوں طرح کے علوم پڑھائے جاتے تھے۔اسی کالج کی تعلیم کے دوران ان کی پہچان اور ملاقات شیخ محمد عبدہ سے ہوئی ۔وہ یہاں ممتحن بن کر آئے تھے۔لطفی السید اس کی تفصیل بیان کرتے ہیں:

> ''شیخ محمد عبدہ کو ہر سال قانون کے طلبہ کا امتحان لینے کے لیے دعوت دی جاتی تھی ۔ میرا تعارف اسی امتحان کی وجہ سے ہوا۔ امتحان میں ہم لوگوں کو انشاء کے پرچہ میں ''حکومت کو مجرم کو سزا دینے کا حق کیسے پہنچتا ہے''۔(کیف کان للحکومة حق عقاب المجرم) کے موضوع پر مقالہ لکھنا تھا مجھے خیال ہے کہ جواب کے لیے کل چار گھنٹے کا وقت دیا گیا تھا۔ چنانچہ میں نے اس مسئلہ کے بارے مین چاروں فقہی مذاہب کے علماء کی تشریحات کا تجزیہ کیا اور پھر ان پر تنقید کر کے یہ ثابت کیا کہ حکومت کو کسی بھی طرح کسی مجرم کو سزا دینے کا حق نہیں پہنچتا ہے۔اس لیے کہ حکومتیں بالعموم حق کے بجائے قوت کے بل پر قائم رہتی ہیں۔ میں نے اپنے خیال کو کافی مدلل بنا کر پیش کیا اور پوری کاپی بھر ڈالی۔

امتحان ہال سے باہر نکل کر جب میں نے اپنے ساتھیوں سے اس کا ذکر کیا تو انہیں
کافی اضطراب اور پریشانی ہوئی۔ ان سب کا خیال تھا کہ میری ناکامی یقینی ہے۔
ان سب نے مجھ پر لعنت ملامت بھیجی۔ میں بھی اپنے دل میں کامیابی کے ہر
امکان کو مسترد کر چکا تھا۔ لیکن زبانی امتحان کے دن میرے موضوع کو شیخ محمد عبدہ
نے اپنے ذمہ لے لیا۔ کچھ دیر گفتگو کے بعد انہوں نے مجھے سب سے اچھے نمبر
دیے۔ تاہم افکار و خیالات میں اعتدال اور میانہ روی پیدا کرنے کی نصیحت کی۔
کیونکہ انہیں ایام شباب میں ان افکار و خیالات سے کچھ اندیشہ ہو گیا تھا''۔ (۲)

شیخ محمد عبدہ نے مذکورہ مضمون پر لطفی السید کی کافی حوصلہ افزائی کی اور انہیں باقاعدہ تصنیف و تالیف سے دلچسپی لینے کا مشورہ دیا۔ اس سے ان کی تحریری صلاحیت کو تحریک ملی۔ اور وہ باضابطہ طور سے صحافت اور انشاء پردازی میں حصہ لینے لگے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے بعض ساتھیوں کی مدد سے ''مجلۃ التشریع'' کی اشاعت اور اس میں زیادہ سے زیادہ مفید اور اہم مضامین کی شمولیت پر توجہ دی۔ اس کے علاوہ بعض دوسرے اخبارات میں بھی لکھنا شروع کیا۔ ''جریدۃ المؤید'' میں کچھ دنوں ان کا تعلق اس مخصوص شعبہ سے تھا جس کا کام غیر ملکی خبروں اور تبصروں کو عربی زبان میں نقل کرنا تھا۔

انہوں نے تعلیم کے دوران ہی ۱۸۹۲ء میں استنبول کا سفر کیا۔ یہاں اتفاق سے ان کی ملاقات شیخ علی یوسف، سعد زغلول اور حفنی ناصف سے ہوئی۔ ان کے توسط سے وہ شیخ جمال الدین کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ وہ ان کی قد آور شخصیت سے بہت متاثر تھے۔ انہوں نے ان سے اجازت لے کر شرف تلمذ حاصل کیا اور ان سے بہت زیادہ مستفید ہوئے۔ ان کا خود بیان ہے کہ انہیں شیخ کی صحبت سے بہت فائدہ ہوا۔ فکر و نظر میں آفاقیت اور احتساب و جائزہ کی عادت ان کو اسی فیض سے حاصل ہو سکی۔

اس کے بعد والے مقالہ میں انہوں نے یہ بتایا کہ ۱۸۹۴ء میں قانون کی تعلیم مکمل کر لینے کے بعد انہوں نے قاہرہ کی عدالت کے محکمۂ استغاثہ (Prosecution) میں کئی حیثیتوں سے کام کیا۔ لیکن ان مصروفیات کے باوجود وہ اپنے فرض منصبی کی ادائیگی سے غافل نہیں ہوئے۔

اور قوم اور حکومت کی اصلاح کے لیے کوشاں رہے۔ ملکی حالات کے پس منظر میں وہ اس وقت دو امور پر زیادہ توجہ دینا ضروری سمجھتے تھے۔ ان میں سے ایک انگریزوں کا مصر سے مکمل انخلاء اور دوسرے دستور کا نفاذ تھا۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے انہوں نے اپنے احباب مثلاً عبدالعزیز فہمی کے ساتھ مل کر ایک خفیہ جماعت تشکیل دی۔ (۳)

اسی مقالہ میں انہوں نے اپنے سفر سوئزرلینڈ کا ذکر کیا ہے۔ یہ سفر اس وقت کے مصری حکمراں خدیو عباس کی تجویز اور خواہش پر کیا گیا تھا۔ ان دنوں خدیو عباس نے انگریزوں کے مکمل انخلاء کے لیے مصر کے تعلیم یافتہ نوجوانوں پر مشتمل ایک خفیہ تنظیم کی بنیاد ڈالی تھی۔ اس پارٹی کی تمام سرگرمیاں خفیہ اور صیغۂ راز میں رکھی جاتی تھیں۔ حتی کہ ان کے متوسلین کے نام بھی رمزی رکھے جاتے تھے۔ خدیو عباس کی یہ خواہش تھی کہ انگریزوں کے خلاف جو مہم چلائی جائے وہ مصر سے باہر ہو۔ چنانچہ انہوں نے لطفی السید کو سوئزرلینڈ جا کر وہاں مختلف ممالک کے نمائندوں اور دیگر اہل علم سے ربط قائم کرنے کی تلقین کی۔ جسے انہوں نے قبول کر لیا۔ وہ اس سفر کے فوائد اور اپنی مصروفیات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "وہاں پہنچ کر میں نے اپنے مشن کی کامیابی کے لیے پوری کوشش کی۔ اس سلسلہ میں مختلف علماء اور سیاست دانوں سے تبادلۂ خیال کیا۔ ان میں سوئزرلینڈ کے مشہور ماہر آثار جناب نیول بھی تھے۔ انہوں نے صاف صاف کہا کہ ہوسکتا ہے کہ یورپ کی ہمدردی آپ لوگوں کو حاصل ہو جائے لیکن میرا خیال یہ ہے کہ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ یوروپی مزاج یہ ہے کہ وہ بغیر ذاتی مفاد کے کسی کی بھی مدد نہیں کر سکتا۔ اس لیے مصریوں کو یہ خیال دل سے نکال دینا چاہیے کہ یورپ کا کوئی ملک بھی انگریزوں کے خلاف ان کی مدد کرے گا۔ اس کے بجائے انہیں اپنی آزادی کی تحریک خود اپنے سہارے چلانی چاہیے۔ یہی طریقہ ان کے لیے زیادہ مفید اور بہتر ہوگا"۔ (۴)

انہیں نیول کے مذکورہ خیالات مبنی بر حقیقت اور کئی پہلو قابل غور اور لائق توجہ نظر آئے۔ جنیوا میں ان کی ملاقات مصر کے کچھ دوسرے زعماء مثلاً شیخ محمد عبدہ، قاسم امین اور سعد زغلول سے

ہوئی اور گفتگو اور تبادلہ خیال کا موقع ملا۔ خاص طور سے شیخ محمد عبدہ کے خیالات کو بہت قریب سے سمجھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ ان سب کی وجہ سے لطفی السید کے سیاسی افکار میں واضح تبدیلی آئی۔ اب ان کا اس حقیقت پر ایمان راسخ ہو چکا تھا کہ مصریوں کی آزادی صرف ان ہی کے ذریعہ ممکن ہے۔ اس کے لیے کوئی بیرونی طاقت کوئی موثر رول ادا نہیں کر سکتی۔ اور مصریوں کو یہ مشکل کام انجام دینے کے لیے مناسب استعداد بہم پہنچانا ضروری ہے۔ جس کا پہلا زینہ تعلیمی ترقی ہے۔ ان کے ان جدید خیالات سے خدیو عباس موافقت نہیں کر سکے۔ اس طرح دونوں کے تعلقات خوش استوار نہیں رہ سکے۔

تیسرے مقالہ میں انہوں نے بتایا کہ سوئزرلینڈ سے واپسی کے بعد وہ محکمہ استغاثہ میں دوبارہ ملازم ہو گئے۔ لیکن بعض اختلافات کی وجہ سے ۱۹۰۵ء میں استعفیٰ دے دیا۔ اور عبدالعزیز فہمی کے ساتھ وکالت کرنے لگے۔ لیکن پیشۂ وکالت کی قباحتوں اور خرابیوں کی وجہ سے وہ بہت دنوں تک اسے بھی انجام نہیں دے سکے۔ اور اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ چونکہ سیاست اور صحافت ان کے پسندیدہ میدان کار تھے اس لیے اب وہ ان دونوں میں سرگرم عمل ہو گئے۔ ان کی نظر میں اپنے سیاسی افکار و خیالات کو پیش کرنے کے لیے صحافت سے بہتر اور کوئی دوسرا ذریعہ نہیں تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے بعض ساتھیوں کے تعاون اور مشورہ سے ۱۹۰۷ء میں ''الجریدۃ'' کے نام سے ایک اخبار جاری کیا۔ اس سے ان کے صحافتی ذوق کو تسکین اور صلاحیتوں کو جلا ملی۔ (۵)

انہوں نے ''الجریدۃ'' اور ''حزب الامۃ'' پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ ''حزب الامۃ'' کا قیام ۱۹۰۷ء میں عمل میں آیا تھا۔ یہ مصر کی پہلی سیاسی جماعت تھی جس نے اپنی سیاسی پالیسی، پروگرام اور اغراض و مقاصد کی باضابطہ وضاحت کی۔ مصر کی مکمل آزادی، دستور کا بتدریج نفاذ اور تمام ضلعی، صوبائی و مرکزی کمیٹیوں کو ان کے اختیارات کی تفویض اس جماعت کے بنیادی مطالبات تھے۔ لطفی السید اس پارٹی کے پہلے سکریٹری منتخب کیے گئے۔ اس جماعت پر شیخ محمد عبدہ کا اثر بہت نمایاں تھا۔ اس میں زیادہ تر مصر کے دانش ور، اصحاب فکر و نظر اور سربرآوردہ لوگ شامل تھے۔ لطفی السید نے اس پارٹی کی ترجمانی کے لیے اپنے اخبار کو وقف کر دیا۔ انہوں نے انتہائی عمدہ اسلوب میں مصر کے مسئلہ آزادی کا تجزیہ کیا اور ان کے اخبار نے اسے کثیر تعداد میں لوگوں سے متعارف

کیا۔اس طرح یہ مسئلہ ایک زندہ مسئلہ بن گیا۔(۶)

ایک اور مقالے میں انہوں نے تفصیل کے ساتھ لارڈ کرومر کی شخصیت اور خیالات و افکار کا جائزہ لیا ہے(۷)، لارڈ کرومر مصر میں برطانیہ حکومت کا نمائندہ تھا۔لطفی السید اوران کی پارٹی ''حزب الامۃ'' کے بارے میں یہ معلوم ہے کہ وہ خدیومصر کی پالیسیوں کے سخت مخالف تھے۔ اور قومی اور وطنی مفادات کے لیے اس کے بالمقابل انگریزوں سے مصالحت کے قائل تھے۔وہ یہ سمجھتے تھے کہ بعض امور مثلاً دستور کے نفاذ اور تعلیم کی نشرواشاعت میں خدیوانگریزوں کے مقابلہ میں زیادہ رکاوٹیں پیدا کررہا ہے۔ادہر انگریز بھی خدیواور عثمانی حکومت کی مخالفت اور حزب الامۃ کے جاگیرداروں وغیرہ میں مقبولیت کی وجہ سے ان سے زیادہ قریب تھے۔اس دوطرفہ تعلق کی بنیاد پر لطفی السید، حزب الامۃ اور پارٹی کے دوسرے ممبران مصر میں عوام وخواص کی طرف سے کافی تنقید کا نشانہ بنے تھے۔انہوں نے اپنی خودنوشت میں لارڈ کرومر اور انگریزوں کے بارے میں اپنا موقف واضح کیا ہے۔اور یہ بتایا ہے کہ مختلف اسباب کی بنیاد پر لارڈ کرومر سے کچھ فوائد کے حصول کی توقع تھی۔خدیو کے مظالم سے نجات اور مصر کی خودمختاری کے حصول کا یہ ایک مناسب راستہ تھا۔پھر انگریزوں کی مخصوص طبیعت اور مزاج کی وجہ سے ان سے یہ توقع تھی کہ وہ ملک میں اصلاح، بیداری اور جمہوری حکومت کے قیام میں مدد دیں گے۔لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ لارڈ کرومر اور انگریزوں کے ہر اقدام کی ہمیشہ حمایت کرتے تھے۔صحیح بات یہ ہے کہ ان کی حمایت قومی مفادات اور مصالح سے مشروط تھی۔چنانچہ جب انہیں انگریزوں کی شاطرانہ چالوں اور ناپسندیدہ عزائم کا علم ہوا تو انہوں نے ان پر سخت تنقید کی۔(۸) ان کی تنقید کا ہدف لارڈ کرومر کی شخصیت بھی بنی۔انہوں نے اس کی نیت پر شک کا اظہار کیا۔خاص طور سے اس کی کتاب ''مصر الحدیثۃ'' پر تنقید کی اور اس کے تمام مزعومات وافکار کو باطل اور بے بنیاد قرار دیا۔

اس مقالہ میں انہوں نے مصریوں کے مزاج، اخلاق اور عقائد وغیرہ کے بارے میں بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔انہوں نے مصری معاشرہ کی اصلاح کا اصل ذمہ دار حکومت کو قرار دیا ہے۔جو ان کی نظر میں اپنے عدم استحکام، عوام کے عدم تعاون، ماتحت حکمرانوں کی باہمی رنجش اور انتظامیہ کی اپنے فرائض سے غفلت کی وجہ سے اس ذمہ داری کو پورا کرنے میں بری

طرح ناکام رہی ہے۔ علاوہ ازیں انہوں نے مصری عوام میں اپنے تشخص اور انفرادیت کے عدم احساس، تعلیم و تربیت سے غفلت، بنیادی حقوق سے عدم واقفیت، بے جا مطالبات کے منوانے کے لیے صلاحیتوں کا ضیاع اور شجاعت و بہادری جیسے اوصاف حمیدہ میں تنزل اور انحطاط کی شکایت کی ہے۔ اور ان میں سے ہر ایک کے ازالہ کی تدبیر بیان کی ہے۔ ان کے علاوہ بھی انہوں نے بعض امور پر گفتگو کی ہے۔(۹)

چھٹے مقالہ میں انہوں نے مصری معاشرت، عوام اور سیاست پر گفتگو کی ہے (۱۰)۔ ساتویں مقالہ میں انہوں نے ''حسن عاصم''، ''مصطفیٰ کامل''، ''قاسم امین'' اور ''احمد اعرابی'' کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کی ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اظہار خیال میں وہ حد سے زیادہ محتاط اور غیر جانبدار ہیں۔ اس کا اندازہ صرف ''احمد اعرابی'' اور ''مصطفیٰ کامل'' کے بارے میں ان کے خیالات کے مطالعہ سے بآسانی لگایا جاسکتا ہے۔ یہ دونوں شخصیتیں لطفی السید کے فکر و مزاج سے ہم آہنگ نہیں تھیں لیکن اس کے باوجود ان سے متعلق ان کے خیالات میں اعتدال اور احتیاط پائی جاتی ہے۔ ان میں سے اعرابی پاشا پر ان کے معاصرین خاص طور سے سخت ناراض تھے۔ وہ انہیں خائن قرار دیتے ہیں۔ اور مصر میں برطانوی کے قیام کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ لیکن لطفی السید نے ان لوگوں کی مخالفت کی ہے۔ اور یہ اعلان کیا ہے کہ اعرابی کے اندر بہت سی اچھائیاں موجود تھیں۔ مصری دستور کی ترتیب و تدوین میں ان کی ذہانت، ذکاوت اور محنت کا بڑا حصہ تھا۔ اس کی بنا پر مصری عوام اور خدیو توفیق پاشا سب ہی ان سے خوش تھے۔ اس کے علاوہ جمہوری حقوق، پارلیمنٹری نظام اور حق انتخاب وغیرہ کی تشریح و تعبیر اور عوام کو ان سے واقف کرانے میں ان کا نمایاں حصہ رہا ہے۔ ان سب کی وجہ سے لطفی السید نے ان کی تعریف کی ہے اور پارٹی سیاست اور گروہ بندی سے بلند ہو کر ان کی حمایت کی ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ انہوں نے اعرابی کی بعض خامیوں اور کمزوریوں کی نشان دہی کر کے ان پر اظہار نکیر کیا ہے (۱۱)، اسی طرح مصطفیٰ کامل کے بارے میں بھی انہوں نے صاف، ستھرا اور معروضی نقطہ نظر اختیار کیا ہے۔ وہ گرچہ مصطفیٰ کامل اور ان کی پارٹی کے مخالف تھے۔ لیکن ان پر اظہار خیال کرتے ہوئے انہوں نے اپنے ساتھیوں اور رفقاء کار کے بھی بعض خیالات کی مخالفت کی اور یہ واضح کیا کہ

مصطفیٰ کامل ایک وطن پرست لیڈر تھا۔اس کی فکر، عمل، کردار، گفتار، الغرض اس کی پوری زندگی وطنیت سے عبارت تھی۔ وہ یہ بھی وضاحت کرتے ہیں کہ بغیر کسی اختلاف مذہب وملت اس کے جنازے میں پوری قوم کا شریک ہوجانا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے ذریعہ لوگوں میں قومی شعور پیدا ہوا ہے۔ اور یہ قوم پرست ان سے محبت کرتے ہیں۔قوم کی اپنے قائد سے اس والہانہ محبت وعقیدت کو پیش نظر رکھتے ہوئے انہوں نے اس کی وفات کے دوسرے دن اس کا ایک مجسمہ تعمیر کرنے کی تجویز رکھی تا کہ اس سے اس کی برتری کا اعتراف ہو۔اور لوگ اسے دیکھ کر سبق حاصل کریں۔انہیں اپنے اس خیال کی وجہ سے اپنے ساتھیوں اور شاگردوں کی طرف سے حیرت واستعجاب اور مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔لیکن انہوں نے اس کی پروانہیں کی۔ (۱۲)

آٹھویں مقالہ میں انہوں نے اپنے بیرونی اسفار کا تذکرہ کیا ہے۔اس میں مدینہ منورہ کی زیارت کا بھی ذکر ہے۔ان کے دیگر اسفار میں سوئزرلینڈ، ترکی اور انگلینڈ کے سفر خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔سوئزرلینڈ اور ترکی کا سفر زندگی کے ابتدائی مرحلہ میں انجام پایا تھا۔ جہاں شیخ محمد عبدہ اور ان کے رفقاء اور ترکی کے پایہ تخت استنبول میں شیخ جمال الدین افغانی سے ان کی ملاقاتیں بڑی مفید اور موثر رہیں۔شیخ جمال الدین افغانی کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

”جب میری ان سے ملاقات ہوئی تو مجھ پر ان کی شخصیت، علم، ذکاوت اور بصیرت کی ہیبت بیٹھ گئی۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ مجھے اپنا شاگرد بنالیں اس پر وہ بہت خوش ہوئے“۔ (۱۳)

انگلینڈ جانے کا مقصد جنگ عظیم اول کے بعد صدر ولسن کے چودہ نکاتی فارمولے سے استفادہ کرنا تھا۔لیکن بیچ راہ ہی میں انہیں معلوم ہوا کہ صدر ولسن نے مصر پر برطانیہ کے تسلط کی اجازت دے دی ہے۔اس کے باوجود یہ لوگ سفر سے بددل نہیں ہوئے اور پیرس کی صلح کانفرنس سے عدل وانصاف کا مطالبہ کیا۔لیکن کوئی سنوائی نہیں ہوئی۔ (۱۴)

نویں مقالہ میں انہوں نے سعد زغلول اور خدیو عباس سے اپنا تعلق اور اس عہد میں مصر کی پہلی سیاسی پارٹی کی تشکیل پر روشنی ڈالی ہے (۱۵)۔ دسویں مقالہ میں انہوں نے جنگ عظیم اول کے بارے میں اپنے اور بعض ساتھیوں کے موقف کو پیش کیا ہے (۱۶)۔ اور یہ بتایا ہے کہ وہ

اس کے بعد مصر کی آزادی کے لیے اہل مصر کی کوششوں کے بار آور ہونے سے تقریباً مایوس ہو گئے ۔ یہاں تک کہ سیاست اور صحافت سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور ایک دوسرا میدان تلاش کیا ۔ جس میں انہیں مصری زندگی کی اصلاح کے ضمن میں اپنی توقعات پوری ہوتی نظر آ رہی تھیں ۔ اور یہ میدان ترجمہ کا تھا ۔ پھر وہ جنگ عظیم اول کے بعد مصر کی مکمل آزادی کے مطالبہ کی توجیہ و تعلیل کرتے ہیں ۔ اور ''الوفد المصری'' کی تشکیل و تعمیر میں اپنے اور اپنے بعض ساتھیوں مثلاً عبدالعزیز فہمی، سعد زغلول، علی شعراوی اور محمد محمود وغیرہ کے کردار کی وضاحت کرتے ہیں ۔ (۱۷)

لطفی السید نے برطانوی حکومت اور مصری وفد کے درمیان جاری مذاکرات کے دوران مصر کے بعض اہم سیاسی لیڈروں کی باہمی چپقلش اور محاذ آرائی سے تنگ آ کر سیاست سے ہمیشہ کے لیے علاحدگی اختیار کر لی ۔ اور ''دار الکتب المصریہ'' سے منسلک ہو کر ترجمہ و تالیف کے کام میں مشغول ہو گئے ۔ اس کے علاوہ قدیم مصری یونیورسٹی کے نصاب تعلیم اور قواعد و ضوابط پر بھی غور و فکر کرتے رہے ۔ گیارہویں مقالہ میں وہ اس یونیورسٹی کے نصاب کی تجدید اور جدید مصری یونیورسٹی کے قیام کے سلسلہ میں اپنی کوششوں کا تعارف کراتے ہیں ۔ (۱۸) بلاشبہ یہ یونیورسٹی مصر کی قومی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے ۔ ۱۹۲۵ء میں انہیں پہلی بار جدید مصری یونیورسٹی کا وائس چانسلر بنایا گیا ۔ اس وقت سے لے کر ۱۹۴۱ء تک وہ کچھ درمیانی وقفوں کو چھوڑ کر اس یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے ۔ انہوں نے اپنی سوانح حیات میں اس طویل وقفے کی داستان کافی تفصیل سے نقل کی ہے ۔ یونیورسٹی میں بعض تقرریاں، طالبات کے داخلہ کی پالیسی، یونیورسٹی کیمپس کی سیاسی اثرات سے تطہیر اور بعض دوسرے اہم کاموں کا دو تین مقالات میں ذکر کیا ہے ۔ ۱۹۲۸ء میں محمد محمود پاشا کے دور وزارت میں وزیر تعلیم کی ذمہ داری سنبھالنے کے اسباب پر انہوں نے روشنی ڈالی ہے ۔ یہ وزارت کچھ دنوں کے بعد ختم ہو گئی اور لطفی السید اپنے گھر واپس آ کر مطالعۂ کتب اور ترجمہ میں مصروف ہو گئے ۔ لیکن پھر انہیں مجبور کر کے دوبارہ وائس چانسلر بننے کے لیے آمادہ کر لیا گیا ۔ (۱۹)

اس سوانح حیات کا خاتمہ اخلاقیات سے متعلق ایک باب پر کیا ہے ۔ جس میں انہوں نے یہ بتایا ہے کہ عالمی امن کا قیام اس کے بغیر ممکن نہیں کہ عوام و خواص کچھ اقدار و ضوابط کے پابند

ہوں اوران پر عمل آوری کے لیے ہر فریق اپنے آپ کو پابند تصور کرے۔ بصورت دیگر یہ دنیا فتنہ و فساد کی آماج گاہ بن جائے گی۔ اور ہر طرف ظلم وعدوان کا دور دورہ ہوگا۔ اسی مقالہ میں انہوں نے ٹالسٹائی اور فتحی زغلول کا بھی ذکر کیا ہے۔ اوران کے افکار اور خدمات کا جائزہ لیا ہے۔ (۲۰)

کتاب پر ایک تجزیاتی نظر: اس خودنوشت کے ابواب اور موضوعات کے مختصر تعارف کے بعد اب اس کے بعض اہم گوشوں پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس سے اس کی خصوصیات اور نقائص ابھر کر سامنے آجائیں گے۔

اس کتاب کے مطالعہ سے سب سے پہلی حقیقت جو ابھر کر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ کتاب اپنے مولف کے افکار و خیالات کی سچی آئینہ دار ہے۔ سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی امور سے متعلق افکار و خیالات، علم سیاست اور علم اخلاق و فلسفہ کے مستحکم اصولوں سے ماخوذ و مستفاد تھے۔ اس میں قدیم یونانی فلسفہ، عربی فلسفہ، جدید یورپی فلسفہ اور جدید علم قانون کی آمیزش تھی۔ اسلامی فلسفہ سے استفادہ کے لیے بطور دلیل وہ اقتباسات پیش کیے جاسکتے ہیں جو ابن رشد، ابن سینا اور ابن حزم کی کتابوں سے ماخوذ و منقول ہیں۔ جدید یورپی فلسفہ سے متاثر ہونے کا اندازہ ان تحریروں سے لگایا جاسکتا ہے جو انہوں نے مغربی مفکرین مثلاً والیٹر اور روسو وغیرہ سے متاثر ہو کر لکھی ہیں۔ وہ جرمنی مفکر، کانٹ'' اور انگریز فلسفی جان اسٹیورٹ سے خاص طور سے متاثر تھے ۔انتفاع اور حریت کا مسلک ان ہی دونوں مفکرین سے تاثر اور استفادہ کا نتیجہ تھا۔

منفعت کا مسلک لطفی السید کی سیاسی اور معاشرتی فکر کی مضبوط اساس تھا۔ کیونکہ ان کی نظر میں منفعت وہ بنیادی جذبہ ہے جو مختلف نوعیتوں کے تعلقات کے قیام و بقاء اور استحکام میں کارفرما ہوتا ہے۔ اسی طرح جان اسٹیوارٹ مل کا ''مذہب حریت'' ان کی معاشرتی اور سیاسی دعوت کی ترتیب و پیش کش میں معاون بنا۔ (۲۱) یونانی فلسفہ میں وہ خاص طور سے ارسطو سے متاثر تھے۔ (۲۲) ''جمہوریت'' کے بارے میں ان کے جو خیالات سامنے آئے ہیں ان میں ارسطو کی فکر صاف طور سے نظر آتی ہے۔ ان کے افکار کا خلاصہ یہ ہے کہ قوم کو خود اپنے اوپر حکومت کرنی چاہیے۔ کسی قوم پر کسی دوسرے کی حکومت کا مطلب یہ ہے کہ اس قوم کے بنیادی حقوق غصب کر لیے گئے ہیں۔ اوران پر کی جانے والی حکومت ظلم و جبر پر مبنی ہے۔ (۲۳) سیاست اور

اخلاق میں ان کے ارسطو سے استفادہ کرنے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے اس کی ان موضوعات سے متعلق کتب مثلاً ''السیاسۃ'' اور ''علم الاخلاق'' کا عربی زبان میں ترجمہ کیا۔

(۲۴) وہ ارسطو کے فلسفہ کی اہمیت اور افادیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''میں بچپن سے فلسفیانہ علوم کی طرف مائل تھا۔ میں نے ارسطو پر توجہ دی کیونکہ وہ علم منطق کا موجد اور اس کا سب سے بڑا مولف ہے۔ اس کے اثرات تمام علوم وفنون پر ہمیشہ باقی رہیں گے۔ جب میں دار الکتب کا ڈائرکٹر تھا تو میں نے اپنے بعض ساتھیوں سے مصر کی علمی نشأۃ ثانیہ کی بنیاد تالیف کے بجائے ترجمہ کو بنانے پر زور دیا تھا۔ کیونکہ یورپی نشاۃ ثانیہ کی بنیاد بھی ترجمہ پر تھی۔ آج ہماری قوم کو جس تربیت کی ضرورت ہے اس کے لیے فلسفہ ارسطو سے زیادہ مفید اور معاون کوئی دوسری چیز نہیں ہے۔ جدید علوم کو عربی زبان میں منتقل کرنا وقت کی ایک اہم ضرورت ہے''۔ (۲۵)

لطفی السید مصر اور عالم عرب میں ایک جدید سیاسی اسکول کے بانی قرار دیے جاتے ہیں۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ فرد اور جماعت دونوں کو اپنی تربیت اور تعلیم وغیرہ پر اس قدر توجہ دینی چاہیے کہ وہ سیاست، ادب، معاشرت اور اخلاق کی اعلیٰ قدروں کو سمجھنے، ان پر عمل پیرا ہونے اور ہر پیش آمدہ مسئلہ کو ان کے مطابق حل کرنے کے لائق ہوسکیں۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ ان ضروری انتظامات کے بغیر مصر میں ترقی اور بیداری کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکے گا۔ انہوں نے اپنی مذکورہ سیاسی اور فکری دعوت کو مزید علمی دلائل سے مزین کیا ہے۔ اور اسے اس قابل بنایا ہے کہ کوئی شخص اس کے انکار یا تغلیط کی کوشش بآسانی نہ کرسکے۔ (۲۶)

ان کے سیاسی، معاشی اور تعلیمی نظریات کی وجہ سے مصر کے بہت سے لوگ ان سے ناراض تھے جس کی وجہ سے ان کے راستہ میں طرح طرح کی رکاوٹیں ڈالنے کی کوشش کی گئی۔ انہوں نے ان تمام باتوں کا ذکر کیا ہے۔ خود انہوں نے اپنے موقف کے بارے میں بڑی جرأت اور حوصلہ کا ثبوت دیا ہے۔ انہوں نے اس کی بعض تفصیلات سے بھی قارئین کو واقف کرانے کی کوشش کی۔ مصطفیٰ کمال اور جمال الدین افغانیؒ کے نظریات سے اپنا اختلاف اور اس کا سبب بھی بیان کیا ہے۔ وہ موخر الذکر رہنما کے تصور اتحاد اسلامی کے مخالف تھے۔ جس کا مقصد تمام مسلمانوں

کو ایک پرچم تلے جمع کرنا تھا۔ یہ دعوت انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں کافی مقبول ہوئی۔ لطفی السید نے ان تمام لوگوں کے علی الرغم ایک نیا سیاسی نظریہ پیش کیا۔ اور یہ نظریہ تھا ''سیاسۃ مصر للمصر ین'' چنانچہ انہوں نے اخبار ''الجریدۃ'' کے پہلے شمارے میں یہ اعلان کیا کہ یہ اخبار ایک مصری اخبار ہے۔ اس کا مقصد اشاعت مصریوں کے مفاد کا تحفظ ہے۔ (۲۷)

اپنی مذکورہ فکر کی بنا پر انہوں نے سب سے پہلے مصر اور عالم عرب میں مروج اس خیال کی تردید کی جس کا محور یہ تھا کہ استعمار کی ہر حال میں مخالفت کی جائے اور عثمانی خلافت سے اپنے تعلقات کسی طرح بہتر بنائے جائیں۔ اس کے برعکس انہوں نے اپنے اس خیال پر زور دیا کہ مصریوں کو اپنے اندر موجود جذباتیت، عجلت پسندی، جہالت، تقلید اور معاشرتی و اخلاقی گراوٹ جیسے معایب سے نجات حاصل کرنے پر اولین توجہ مرکوز کرنی چاہیے۔ اور اس کے لیے زیادہ سے زیادہ تعلیم کے حصول اور اخلاقی تربیت میں کمال تک پہنچنے کی تگ و دو کرنی چاہیے۔ کیونکہ اس کے بعد ہی انہیں آزادی مل سکے گی۔ اور ان کے مفادات کا تحفظ ہوگا۔ (۲۸)

فرد اور قوم کی اصلاح کے لیے جیسا کہ گذر چکا ہے لطفی السید نے ارسطو کے فلسفہ کو عربی زبان میں منتقل کرنا ضروری سمجھا۔ کیونکہ وہ اسے جدید معاصر فکر کی کلید سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک جدید فلسفیانہ مذاہب اور قدیم عربی فلسفہ کی بنیاد اسی پر قائم ہے۔ اور یہ فلسفہ ہمارے موجودہ حالات سے بے حد ہم آہنگ ہے۔ اس لیے اسے اپنی زبان میں منتقل کر کے مغرب کی طرح مشرق میں بھی بیداری کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ بلاشبہ ارسطو سیاست، معاشرت اور فلسفہ کا معلم تھا۔ لطفی السید نے اس نظریہ کے تحت اس کی جن کتابوں کا ترجمہ کیا ان میں اخلاق اور سیاست کے علاوہ ''کتاب الطبیعۃ'' اور ''الکون والفساد'' بھی ہیں۔ (۲۹)

انہوں نے یہ اعتراف کیا ہے کہ ان سے پہلے فتحی زغلول نے قوم اور فرد کی اصلاح اور تربیت کے لیے ترجمہ کی ضرورت کا احساس کیا تھا۔ انہوں نے قوم کو اس کے حقوق سے متعارف کرانے، حریت اور جمہوریت کے مفہوم سے آگاہ کرنے اور ان کے درمیان علمی اصول وضوابط عام کرنے کے لیے متعدد کتابوں کا ترجمہ کیا ہے۔ جن میں روسو کی ''العقد الاجتماعی'' کے علاوہ ''الفرد ضد الامۃ''، ''روح الاجتماع'' اور ''سر تطور الامم'' قابل ذکر ہیں۔ ان کتابوں سے عربوں کو

دوسری قوموں کے تجربات سے فائدہ اٹھانے اور اپنی زندگی پر منطبق کرنے اور اپنی شخصیت کو بنانے ،سنوارنے اور نمایاں کرنے میں بڑی مدد ملی ۔لطفی السید نے اس کام کو آگے بڑھایا۔وہ پوری قوم اور معاشرے کی اصلاح کے لیے فرد کی اصلاح و تربیت کو مقدم سمجھتے تھے۔فی الواقع اخبار ''الجریدۃ'' کے اجراء کا مقصد وحید یہی تھا۔وہ اپنی اسی مخصوص فلسفیانہ فکر کی بنیاد پر ایک نئے مکتب فکر کے بانی قرار پائے۔بعد میں اس فکر کے حامیوں کی تعداد بڑھتی گئی۔(۳۰)

ان کی خودنوشت کا اسلوب تحلیلی اور تفسیری ہے۔مقالہ نگاری میں ان کو مہارت کاملہ حاصل تھی۔جس کے لیے مذکورہ اسلوب سب سے زیادہ موزوں قرار دیا گیا ہے۔انہوں نے اس اسلوب کے ذریعہ اپنی زندگی کے مختلف مراحل اور اپنی شخصیت کے مختلف گوشے پیش کر دیے ہیں۔فکر و فلسفہ اور قانون وغیرہ سے زیادہ قریب ہونے کی وجہ سے ہر معاملے کا تجزیہ و تحلیل ان کے مزاج کا حصہ بن گیا تھا۔جس کی وجہ سے انہوں نے مختلف افکار و خیالات کی تشریح و تعبیر کی اور بوقت ضرورت اپنی ذات کے دفاع کا کام بھی کیا ہے۔(۳۱)

چونکہ ان کی شخصیت منطقی ،فلسفیانہ اور باریک بیں تھی اور انہیں لغت وغیرہ سے بڑی دلچسپی تھی ،اس لیے ان تمام اوصاف کا اثر ان کی خودنوشت میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔(۳۲) اپنے مخصوص مزاج کی وجہ سے وہ انتہائی نرم اور سرد انداز میں علمی مباحث میں حصہ لیتے تھے۔کہیں کوئی جھنجھلاہٹ اور خفگی کے آثار نظر نہیں آتے۔ان کا طرز تحریر یہ ہے کہ وہ ایک کے بعد دوسری دلیل دیتے ہوئے اخیر میں محکم نتیجہ نکالتے ہیں ،ان کے دلائل اور براہین بڑے محکم اور وزنی ہوتے ہیں۔دوران گفتگو وہ حتی الامکان اپنے ذاتی احوال و کوائف اور معاملات وغیرہ سے بالکل الگ ہو جاتے ہیں۔اس طرح ان کے یہاں جذبات کی حرارت نہیں پائی جاتی۔اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنی مخصوص شخصی خوبیوں کی بنا پر معروضی طرز تحریر کے دل دادہ تھے۔وہ عقلی اور منطقی قیاس پر اکثر اعتماد کرتے تھے۔دیگر خوبیوں کے علاوہ ان کے اسلوب میں کہیں سنجیدگی کا فقدان ،سطحیت اور گھٹیا پن نظر نہیں آتا۔یہ بھی ان کی شخصیت کا ایک نمایاں وصف تھا۔اس کے علاوہ بھی ان کی شخصیت کے دیگر اہم اوصاف و خصائص ان کے اسلوب میں صاف نظر آتے ہیں۔(۳۳)

ادبی اعتبار سے گرچہ اس خودنوشت سوانح عمری کو کوئی اہم مقام نہیں دیا جا سکتا لیکن فکری

اعتبار سے یہ ایک گراں قدر اور اثر انگیز تالیف ہے۔ کیونکہ اس میں مصر کی سیاسی اور فکری تاریخ کے ایک دور کی تصویر پیش کی گئی ہے۔ جو نصف صدی سے زاید عرصہ پر محیط ہے۔ گرچہ انہوں نے اس کتاب میں زیادہ تر ان افکار و خیالات اور کرداروں کی وضاحت کی ہے جن سے ان کا سابقہ ہوا تھا لیکن اس میں دوسروں کے متعلق بہت سی تفصیلات آگئی ہیں۔ مولف چونکہ ایک سرگرم سیاسی زندگی گزار چکے تھے۔ اس لیے ان سے بجا طور سے توقع تھی کہ وہ بہت سے ایسے لائق توجہ امور زیر بحث لائیں گے جن کی مدد سے پورے دور پر اہم اور مفید ذخیرہ معلومات میسر آجائے گا۔ بلاشبہ یہ توقع پوری بھی ہوئی۔

اس کتاب کی مختلف فصلوں کے مابین کوئی بہت مضبوط رابطہ نہیں ہے۔ بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ ان میں ربط، یگانگت اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی شعوری کوشش سرے سے مفقود ہے۔ اگر نظم و ترتیب کے نام سے کوئی کوشش ہے تو صرف یہ ہے کہ مختلف مراحل حیات کو بیان کرنے میں زمانی تدریج اور ترتیب کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

اس خودنوشت میں رابطہ اور نظم کا فقدان اپنی جگہ پر، لیکن اس کے باوجود اس میں مصنف کے بچپن سے بڑھاپے تک کا ہر مرحلہ حیات بالکل واضح اور صاف ہے۔ خاص طور سے ابتدائی تعلیم اور تربیت کے بارے میں بہت زیادہ تفصیلات موجود ہیں۔ مولف نے صراحت سے لکھا ہے کہ انہیں بچپن سے اپنی تربیت کا خیال تھا۔ چنانچہ وہ ثانوی تعلیم کے دوران ہی ڈارون کی کتاب ''اصل الانواع'' کا مطالعہ کر چکے تھے۔ اسی طرح انہیں اسکول کی زندگی کے ابتدائی مرحلہ ہی میں بہت سے مشہور شعراء کے اشعار زبانی یاد ہو گئے تھے۔ اس مرحلہ میں فقہ اور شعر سے ان کی دلچسپی کا اندازہ ان کے اس بیان سے کیا جاسکتا ہے کہ وہ اور ان کے بعض ساتھیوں نے ''مجلۃ التشریع'' کا اجراء اپنے زمانہ طالب علمی ہی میں کیا تھا۔ فقہ میں اس دلچسپی کا سہرا شیخ محمد عبدہٗ، شیخ حسونہ نواوی اور شیخ حسن طویل کے سر جاتا ہے۔ (۳۴)

جدید خودنوشت سوانح عمریوں میں جو نمایاں اوصاف پائے جاتے ہیں اور جن کی وجہ سے یہ سوانح عمریاں قدیم سوانح عمریوں سے ممتاز قرار پائی ہیں۔ (مثلاً ماحول اور وراثت کے اثرات کا بیان، عہد طفولیت کی تصویر کشی، اسلوب کی شخصیت سے ہم آہنگی، اندرونی کشمکش اور تصادم کی وضاحت، صداقت، جرأت اور معروضیت وغیرہ) ان میں سے بیشتر اوصاف اس

خودنوشت میں بھی پائے جاتے ہیں۔اس لیے یہ کتاب اس قابل ہے کہ عربی ادب اور مصری تاریخ کے شائقین اس کا مطالعہ اور اس سے استفادہ کریں۔لیکن ساتھ ہی یہ انتباہ بھی ضروری ہے کہ یہ کتاب مصر اور عالم عرب میں موجود کئی فکری، ادبی اور سیاسی رجحانات اور میلانات میں سے ایک مخصوص رجحان کی ترجمان ہے۔اس کے علاوہ دوسرے رجحانات وخیالات کے حاملین اور علم برداران بھی اس زمانے میں موجود تھے۔اوران کی زیرنگرانی کئی موثر تحریکات، ادارے اور انجمنیں قائم تھیں۔اس لیے اس پورے عہد کی صحیح تاریخ اور مختلف افکاروخیالات کے صحیح تجزیہ اور متعدد حقائق و واقعات کے لیے ضروری ہے کہ بیسویں صدی کے نصف اول کی دیگر مصری شخصیات اور تحریکات وغیرہ کا بھی مطالعہ کیا جائے اور اس کی روشنی میں مختلف امور و مسائل کے بارے میں جامع، متوازن اور معتدل رائے قائم کی جائے۔

حوالے

(۱) احمد لطفی السید، قصة حیاتی، دار الہلال ۱۹۶۲ء، ص ۱۷-۲۳۔ (۲) قصہ حیاتی، ص ۲۴-۲۵۔ (۳) ایضاً ص ۳۱-۳۴۔ (۴) ایضاً ص ۳۵-۳۹۔ (۵) ایضاً ص ۴۱-۴۲۔ (۶) ایضاً ص ۴۳-۴۷۔ (۷) ایضاً ص ۵۱-۶۱۔ (۸) ایضاً ص ۶۴-۷۰۔ (۹) ایضاً ص ۷۱-۷۷۔ (۱۰) ایضاً ص ۷۹-۹۱۔ (۱۱) ایضاً ص ۱۰۴۔ (۱۲) ایضاً ص ۹۳-۱۰۶۔ (۱۳) ایضاً ص ۲۳۔ (۱۴) ایضاً ص ۱۰۸-۱۳۰۔ (۱۵) ایضاً ص ۱۳۸-۱۴۳۔ (۱۶) ایضاً ص ۱۵۹-۱۷۰۔ (۱۷) ایضاً ص ۱۷۱-۱۸۱۔ (۱۸) ایضاً ص ۱۸۲-۱۹۲۔ (۱۹) ایضاً ص ۱۹۳-۲۰۰۔ (۲۰) ایضاً ص ۲۰۱-۲۱۴۔ (۲۱) حسین فوزی، احمد لطفی السید، قاہرہ ۱۹۶۵ء، ص ۱۷۶۔ (۲۲) المجلہ، مقالة عباس محمد العقاد، مئی ۱۹۶۳ء، ص ۶۔ (۲۳) صالح جودت، مجلّہ الہلال جون ۱۹۶۳ء، ص ۴۸۔ (۲۴) ایضاً ص ۴۹۔ (۲۵) احمد لطفی السید، قصة حیاتی، ص ۱۶۸-۱۶۹۔ (۲۶) عبداللطیف حمزہ، ادب المقالة الصحفية فی مصر، ص ۱۳۱-۱۳۷، دار الفکر العربی قاہرہ ۱۹۶۱ء۔ (۲۷) احمد لطفی السید، قصة حیاتی، ص ۱۴۔ (۲۸) حسین فوزی، احمد لطفی السید، ص ۲۵۷/۲۸۱۔ (۲۹) احمد لطفی السید، قصة حیاتی، ص ۱۶۵۔ (۳۰) مصطفیٰ الشہابی، مجلة مجمع اللغة العربية بدمشق اپریل ۱۹۶۳ء۔ (۳۱) یوسف کوکن، اعلام الشعر والنثر فی العصر العربی الحدیث، ص ۶، دار حافظة مدراس ۱۹۸۴ء۔ (۳۲) عبداللطیف حمزہ، ادب المقالة الصحفية فی مصر، ج ۶، ص ۱۷۹۔ (۳۳) طٰہٰ حسین، حدیث الاربعاء ج ۳، ص ۵۰، دار المعارف مصر ۱۹۵۷ء۔ (۳۴) احمد لطفی السید، قصة حیاتی، ص ۲۴-۲۵۔

روزے کی جسمانی ونفسیاتی افادیت
میڈیکل سائنس کی روشنی میں

ڈاکٹر محمد سلطان شاہ

اسلام دین فطرت ہے اور ہر شعبہ زیست میں راہ اعتدال کی تعلیم دیتا ہے۔آج مغرب میں بھی خورد ونوش میں زیادتی کو ناپسند کیا جاتا ہے اور اسے صحت انسانی کے لیے مضر گردانا جاتا ہے۔اللہ تعالیٰ جل شانہ نے اپنے محبوب مکرم نبی معظم رسول اکرم ﷺ پر یہ وحی نازل فرمائی:

وَ کُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ۔(۱)

اور کھاؤ اور پیو اور حد سے نہ بڑھو، بے شک حد سے بڑھنے والے اسے پسند نہیں۔

حضور نبی کریم ﷺ نے کھانے پینے میں اسراف سے منع فرمایا ہے۔حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

وکلوا واشربوا والبسوا وتصدقوا فی غیر اسراف ولا مخیلة ۔(۲)

کھاؤ، پیو اور پہنو اور خیرات کرو بغیر فضول خرچی اور تکبر کے۔

ڈاکٹر محمد عثمان نجاتی لکھتے ہیں کہ کھانے میں اسراف صحت کے لیے مضر ہے اور بسیار خوری کی وجہ سے جسم موٹا ہو جاتا ہے جس سے بہت سے امراض پیدا ہو جاتے ہیں ۔ واقعہ یہ ہے کہ انسان کو کھانے کی صرف تھوڑی مقدار کی ضرورت ہے، جو انسانی جسم میں اتنی توانائی پیدا کر سکے جتنی توانائی انسانی زندگی کے لیے ضروری ہے اور جس سے اس کی صحت اچھی رہ سکے اور وہ اپنی روزمرہ کی ذمہ داریاں پوری کر سکے۔ انسانی جسم کو جتنے کھانے کی ضرورت ہے، اس سے زائد

جامعہ ہمدرد (ہمدرد یونیورسٹی) ہمدرد نگر، نیو دہلی ۱۱۰۰۶۲۔

جسم میں داخل ہونے والا کھانا چربی بن جاتا ہے جس کی وجہ سے انسان کا وزن بڑھ جاتا ہے، اس کی رفتار سست ہو جاتی ہے اور انسان بہت جلد درماندگی اور تکان کا احساس کرنے لگتا ہے، نیز انسانی جسم بہت سے امراض کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس تفصیل سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ کھانے میں اسراف سے قرآن وسنت نے جو ممانعت کی ہے، اس کے پیچھے کیا حکمت کارفرما ہے۔(۳) بسیار خوری سے انسان کو لاحق ہونے والی مضرت تمام طریقہ ہائے علاج میں مسلم ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے روزے فرض کیے ہیں تاکہ گیارہ ماہ کے دوران خورد ونوش کی بے احتیاطی کے مضر اثرات کا ازالہ ہو سکے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ جل شانہ نے روزے رکھنے کا حکم ان الفاظ میں دیا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ	اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کیے گئے
الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ	ہیں جیسے ان لوگوں پر فرض کیے گئے تھے جو تم
مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ۔(۴)	سے پہلے تھے تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔

قرآن کریم نے بیمار اور مسافر کے لیے روزے موخر کرنے اور جو روزے نہ رکھ سکیں، ان کے لیے فدیہ ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس کے بعد روزے کی حکمت ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے:

وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ	اور تمہارے لیے روزہ رکھنا ہی بہتر ہے اگر تم
تَعْلَمُونَ۔(۵)	جانتے ہو۔

دراصل یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ اگر تم حیاتیاتی علم کو سمجھو تو تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ تم روزے رکھو۔ کیونکہ روزہ اپنے اندر بے شمار روحانی، نفسیاتی اور طبی فوائد رکھتا ہے۔ روزے کی طبی افادیت کی طرف نہایت مختصر مگر بلیغ اشارہ حضور نبی اکرم ﷺ نے ان الفاظ میں فرمایا:

صوموا تصحوا۔(۶)	روزے رکھو، تن درست ہو جاؤ گے۔

حکیم محمد سعید شہید لکھتے ہیں ”روزہ جسم میں پہلے سے موجود امراض وآلام کا علاج بھی ہے اور حفظ ما تقدم کی ایک تدبیر بھی۔ روزہ رکھنے والا صرف بیماریوں سے ہی نجات نہیں پاتا بلکہ ان کے لاحق ہونے کے ممکنہ خطرات سے بھی محفوظ ہو جاتا ہے۔ اس کا طبی سبب یہ ہے کہ روزے سے قوت مدافعت بڑھ جاتی ہے“۔(۷)

حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

لکل شئی زکاۃ و زکاۃ الجسد الصوم ۔(۸) ہر شے کی زکوٰۃ ہے اور جسم کی زکوٰۃ روزہ ہے۔

اس حدیث مبارکہ کا مفہوم یہ ہے کہ جس طرح زکوٰۃ مال کو پاک کر دیتی ہے، اسی طرح روزہ جسم کی زکوٰۃ ہے اور اس کے ادا کرنے سے جسم تمام بیماریوں سے پاک ہو جاتا ہے بلکہ کذب، غیبت، حسد اور بغض جیسی باطنی بیماریوں سے بھی نجات مل جاتی ہے۔

حافظ ابن قیم کے مطابق روزے کا شمار روحانی اور طبعی دواؤں میں کیا جاتا ہے۔ اگر روزہ داران چیزوں کو ملحوظ رکھے جن کا طبعی اور شرعی طور پر رکھنا ضروری ہے تو اس سے دل اور بدن کو بے حد نفع پہنچے گا۔(۹)

ڈاکٹر حکیم سید محمد کمال الدین حسین ہمدانی صدر شعبۂ طب و جراحت مسلم یونیورسٹی روزہ کے جسمانی فوائد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''نماز کی طرح روزہ بھی ایک مفید صحت فریضہ ہے جس سے جسم کی اصلاح ہوتی ہے......اور جسم سے اکثر علل و امراض دفع ہو جاتے ہیں''۔(۱۰)

ڈاکٹر محمد عالم گیر خان سابق پروفیسر آف میڈیسن، کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج، لاہور بھی روزے کو ان گنت طبی فوائد کا سرچشمہ قرار دیتے ہیں(۱۱)۔ تُرک اسکالر ڈاکٹر ہلوک نور باقی کے مطابق جیسے جیسے طبی علم نے ترقی کی، اس حقیقت کا بہ تدریج علم حاصل ہوا کہ روزہ تو ایک طبی معجزہ ہے(۱۲)۔ کریم اللہ، آمنہ اور اے۔ آر۔ غنی اپنے ایک تحقیقی مقالہ بعنوان Ramadan Fasting: Medical and Physical Aspects میں دعویٰ کرتے ہیں کہ روزہ متعدد بیماریوں کا علاج ہے۔(۱۳)

روزہ ہمیں صحت مند رکھنے، ہمارے امراض کو دفع کرنے اور مختلف بیماریوں کے خلاف ہماری قوت مدافعت بڑھانے میں انتہائی مدد و معاون ہے۔ آیندہ سطور میں روزے کی طبی افادیت کا تفصیلاً جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

روزہ اور نظام انہضام: نظام انہضام (digestive system) مختلف اعضاء پر مشتمل ہے جن میں ایلیمنٹری کینال (alimentary canal) اور ہاضمے کے غدود (digestive glands)

شامل ہیں۔ ایلیمنٹری کینال منہ سے شروع ہوکر مقعد پر اختتام پذیر ہوتی ہیں۔ اس میں جوف دہن، ایسوفیکس، معدہ اور آنتیں شامل ہیں۔ جگر اور لبلبہ ہاضمے کے غدود ہیں جن کی رطوبتیں خوراک میں شامل ہوکر اس کو ہضم کرنے میں مدد دیتی ہیں۔ جب ہم کھانا کھاتے ہیں تو پورا نظام انہضام اس کو ہضم کرنے میں لگ جاتا ہے۔

انسان کو آرام کی بہت ضرورت ہے اور نینداس کا بڑا ذریعہ ہے لیکن سونے کی حالت میں بھی بہت سے جسمانی افعال رواں دواں رہتے ہیں۔ مثلاً دل، پھیپھڑے، نظام ہضم میں معدہ، آنتیں، جگر، بہت سے ہارمون اور رطوبت، گردہ وغیرہ۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ سب نظام ایک دوسرے کے ساتھ منسلک ہیں اور خوراک ان کی محرک ہے۔ اگر ہم اپنے روزمرہ معمولات کا بغور مطالعہ کریں تو ظاہر ہوگا کہ جسم کے ان شعبوں کو بہت کم آرام ملتا ہے۔ رات کے کھانے کو ہضم کرتے کرتے صبح کے ناشتے کا وقت ہوجاتا ہے اور جو لوگ دیر میں سوتے ہیں وہ رات کے کھانے کے بعد بھی کچھ نہ کچھ کھاتے پیتے رہتے ہیں۔ (۱۴) روزے سے معدہ، آنتوں، جگر اور گردوں کو آرام کا موقع ملتا ہے اور سال کے دوران ایک ماہ کا آرام ان کی کارکردگی میں خاطر خواہ بہتری کا موجب بنتا ہے۔ (۱۵)

ڈاکٹر ہلوک نور باقی (۱۶) نے نظام انہضام پر روزے کے اثرات کا تفصیل سے مطالعہ کیا ہے، جس کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

روزے کا حیران کن اثر خاص طور پر جگر (liver) پر ہوتا ہے کیونکہ جگر کے کھانا ہضم کرنے کے علاوہ پندرہ مزید افعال بھی ہوتے ہیں۔ یہ اس طرح تکان کا شکار ہوجاتا ہے جیسے ایک چوکیدار ساری عمر کے لیے پہرے پر کھڑا ہو۔ روزہ کے ذریعے جگر کو چار سے چھ گھنٹوں تک آرام مل جاتا ہے۔ یہ روزہ کے بغیر قطعی ناممکن ہے۔ جگر پر روزہ کی برکات کا مفید اثر پڑتا ہے جیسے جگر کے انتہائی مشکل کاموں میں ایک کام اس توازن کو برقرار رکھنا ہے جو غیر ہضم شدہ خوراک اور تحلیل شدہ خوراک کے مابین ہوتا ہے۔ اسے یا تو ہر لقمے کو سٹور میں رکھنا ہوتا ہے یا پھر خون کے ذریعے اس کو ہضم ہوکر تحلیل ہوجانے کے عمل کی نگرانی کرنا پڑتی ہے۔ روزے کے ذریعے جگر توانائی بخش کھانے کے سٹور کرنے کے عمل سے بڑی حد تک آزاد ہوجاتا ہے اور اپنی

توانائی (globulins) پیدا کرنے پر صرف کرتا ہے، جو جسم کے مدافعاتی نظام (immune system) کی تقویت کا باعث ہے۔

انسانی معدے پر روزے کے انتہائی مثبت اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ روزے سے معدہ سے خارج ہونے والے (gastric juice) کی پیداوار اور اخراج میں مثبت تبدیلی آتی ہے۔ روزہ کے دوران تیزابیت نہیں ہوتی کیونکہ گیسٹرک جوس خارج نہیں ہوتا جس میں موجود ہائیڈرو کلورک ایسڈ تیزابیت کا باعث بنتا ہے۔ روزہ آنتوں کو بھی آرام فراہم کرتا ہے۔

حکیم ہمدانی اشتہا پر روزے کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''دن بھر کھاتے پیتے رہنے کی صورت میں اشتہائے صادق شاذ و نادر محسوس ہوتی ہے اور بغیر اشتہائے صادق محسوس ہوئے وقت مقرر پر غذا استعمال کر لی جاتی ہے، جس سے سوءِ ہضم، نفخ، ڈکار، قبض، اسہال، قے وغیرہ جیسے امراض پیدا ہو جاتے ہیں لیکن بحالت روزہ دن بھر کی بھوک و پیاس کے بعد اشتہائے صادق بلکہ اشتہائے شدید محسوس ہوتی ہے اور جب وقت افطار غذا استعمال کی جاتی ہے تو اس کا انہضام و انجذاب جسم میں تیزی سے ہوتا ہے اور ہضم بھی قوی ہو جاتا ہے''۔ (۱۷)

ایلن کاٹ (Allan Cott) نے ۱۹۷۵ء میں اپنی تحقیق کے بعد یہ نتیجہ نکالا:

"Fasting brings a wholesome physiological rest for the digestive tract and central nervous system and normalizes metabolism" (۱۸)

روزہ اور نظام دوران خون: روزے سے نظام دوران خون (circulatory system) پر مرتب ہونے والے فائدہ مند اثرات کے بارے میں ترکی کے معروف اسکالر ڈاکٹر ہلوک نور باقی رقم طراز ہیں:

''دن میں روزہ کے دوران خون کی مقدار میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ یہ اثر دل کو انتہائی فائدہ مند آرام مہیا کرتا ہے۔ زیادہ اہم یہ بات ہے کہ خلیات

کے درمیان (intercellular) مائع کی مقدار میں کمی کی وجہ سے ٹشوز یعنی پٹھوں پر دباؤ کم ہوجاتا ہے۔ پٹھوں پر دباؤ یا ڈائسٹا لک پریشر ہمیشہ کم سطح پر ہوتا ہے یعنی اس وقت دل آرام یا ریسٹ کی صورت میں ہوتا ہے۔ مزید برآں دل آجکل ماڈرن زندگی کے مخصوص حالات کی بدولت شدید تناؤ یا hypertension کا شکار ہے۔ رمضان کے ایک ماہ کے روزے بطور خاص ڈائسٹا لک پریشر کو کم کرکے انسان کو بے پناہ فائدہ پہنچاتے ہیں۔ روزے کا سب سے اہم اثر دوران خون پر اس پہلو سے ہے کہ اس سے خون کی شریانوں پر اس کے اثر کا جائزہ لیا جائے۔ اس حقیقت کا علم عام ہے کہ خون کی شریانوں کی کمزوری اور فرسودگی کی اہم ترین وجہوں میں سے ایک وجہ خون میں باقی ماندہ مادے (remanants) کا پوری طرح تحلیل نہ ہوسکنا ہے جب کہ دوسری طرف روزے میں بطور خاص افطار کے وقت خون میں موجود غذائیت کے تمام ذرے تحلیل ہوچکے ہوتے ہیں۔ ان میں سے کچھ بھی باقی نہیں بچتا۔ اس طرح خون کی شریانوں کی دیواروں پر چربی یا دیگر اجزاء جم نہیں پاتے اور شریانیں سکڑنے سے محفوظ رہتی ہیں۔ چنانچہ موجودہ دور کی انتہائی خطرناک بیماریوں جس میں شریانوں کی دیواروں کی سختی (arteriosclerosis) نمایاں ترین ہے، سے بچنے کی بہترین تدبیر روزہ ہی ہے"۔(۱۹)

حکیم محمد سعید شہید نے روزہ کی افادیت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے "آج جدید سائنس نے ثابت کردیا ہے کہ روزہ کولیسٹرول کو ضائع کرتا ہے یہ وہی خون کا کولیسٹرول ہے کہ جو دل کی بیماریوں کا سب سے بڑا سبب ہے۔ آج کی دنیا میں اس سائنسی انکشاف کے لحاظ سے روزہ ایک برکت ہے جو بات آج سائنس دانوں کو معلوم ہوئی ہے، اس کا ادراک ذات ختم الرسل ﷺ کو تھا اور ضرور تھا۔ اسی لیے آنحضور ﷺ نے روزے کو جسم وروح کے لیے باعث خیر وبرکت قرار دیا"۔(۲۰)

محمد فاروق کمال ایم فارمیسی (لندن یونیورسٹی) کے مطابق جسم میں وقتی طور پر پانی کی کمی بلڈ پریشر کو کم کرکے دل کو آرام کا موقع دیتی ہے اور اس کی طاقت بحال کرنے میں مددگار

ثابت ہوتی ہے۔ بھوک سے جسم میں چربی کم ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ خون میں اور نالیوں میں بھی چربی کی مقدار کم ہونے کا عمل شروع ہوجاتا ہے۔ (۲۱)

- عبداللہ اے۔ العثمان نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے:

"Fasting in Ramadan significantly reduces the Cholesterol level"۔ (۲۲)

(رمضان کے روزے کولیسٹرول کی سطح میں واضح کمی کا باعث ہیں)

اس محقق نے جو معلومات جمع کیے ہیں ان سے روزے کے دوران جسم کے وزن، پلازما کولیسٹرول اور ٹرائی گلیسرائیڈ کے کنٹرول کرنے کی نشان دہی ہوتی ہے۔ حکیم کمال الدین ہمدانی بھی روزے کو بلڈ پریشر کے لیے مفید قرار دیتے ہیں۔ (۲۳) ڈاکٹر شاہد اطہر ایم ڈی۔ ایسوسی ایٹ پروفیسر انڈیانا یونیورسٹی اسکول آف میڈیسن لکھتے ہیں کہ وہ رمضان کے آغاز اور اختتام پر اپنا بلڈ گلوکوز، کولیسٹرول اور ٹرائی گلیسرائیڈ خود چیک کرتے ہیں تاکہ وہ روزے رکھنے کے بعد فرق معلوم کرسکیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ رمضان کے آخر میں واضح بہتری سامنے آتی ہے۔ (۲۴)

روزہ اور جسم کے خلیات: ڈاکٹر ہلوک نور باقی کے مطابق روزے کا سب سے اہم اثر خلیوں اور ان کے اندرونی مادوں کے درمیان توازن کو قائم پذیر رکھنا ہے۔ چونکہ روزے کے دوران مختلف سیال مقدار میں کم ہوجاتے ہیں۔ خلیوں کے عمل میں بڑی حد تک سکون پیدا ہوجاتا ہے۔ اس طرح لعاب دار جھلی کی بالائی سطح سے متعلق خلیے جنہیں اپی تھیلیل (epithelial) سیل کہتے ہیں اور جو جسم کی رطوبت کے متواتر اخراج کے ذمہ دار ہوتے ہیں ان کو بھی روزے کے ذریعے بڑی حد تک آرام وسکون ملتا ہے جس کی وجہ سے ان کی صحت مندی میں اضافہ ہوتا ہے۔ علم خلیاتیات کے نقطۂ نظر سے یہ کہا جاتا ہے کہ لعاب بنانے والے (pitutary) غدود، گردن کے غدود تیموسیہ (fhyriod) اور لبلبہ (pancreas) کے غدود شدید بے چینی سے ماہ رمضان کا انتظار کرتے ہیں تاکہ روزے کی برکت سے کچھ ستانے کا موقع حاصل کرسکیں اور مزید کام کرنے کے لیے اپنی توانائیوں کو جلا دے سکیں۔ (۲۵)

روزہ اور خون بننے کا عمل: خون ہڈیوں کے گودے میں بنتا ہے۔ جب کبھی جسم کو خون

کی ضرورت پڑتی ہے ایک خودکار نظام ہڈی کے گودے کو حرکت پذیر (stimulate) کردیتا ہے۔ کمزور اور لاغر میں یہ گودہ بطور خاص سست حالت میں ہوتا ہے.........روزے کے دوران جب خون میں غذائی مادے کم ترین سطح پر ہوتے ہیں، ہڈیوں کا گودہ حرکت پذیر ہوجاتا ہے۔اس کے نتیجے میں لاغر لوگ روزہ رکھ کر آسانی سے اپنے اندر خون پیدا کرسکتے ہیں۔ چونکہ روزے کے دوران جگر کو ضروری آرام مل جاتا ہے، یہ ہڈی کے گودے کے لیے ضرورت کے مطابق اتنا مواد مہیا کردیتا ہے جس سے بآسانی اور زیادہ مقدار میں خون پیدا ہوسکے۔(۲۶)

فارماسسٹ محمد فاروق کمال نے لکھا ہے:

''سائنسی تحقیق کے مطابق روزے کے دوران بھوک کی وجہ سے اور خون میں غذائیت کی کمی کے باعث ہڈیوں کے گودے خون بنانے کا عمل تیز کردیتے ہیں یوں خون بنانے کے سسٹم کی اوور ہالنگ ہوجاتی ہے''۔(۲۷)

روزہ اور نظام اخراج: ڈاکٹر محمد عالم گیر خان لکھتے ہیں ''سحری وافطار کے وقت پانی عام مقدار سے زیادہ پیا جاتا ہے۔جس سے صبح وشام گردوں کی دھلائی ہوتی رہتی ہے۔اگر ریت کے ذرات گردوں میں اکٹھے ہوجائیں تو وہ بھی پیشاب کی زیادتی کی وجہ سے نکل جاتے ہیں''۔(۲۸)

ہمدرد فاؤنڈیشن کے موسس حکیم محمد سعید کے یہ الفاظ بھی لائق مطالعہ ہیں:

''طبی نقطہ نظر سے روزہ اس لیے ضروری ہے کہ ترک غذا سے انسان کے جسم میں جمع شدہ اجزائے زائد اور مواد غیر ضروری خارج ہوجاتے ہیں اور خون اور اعضائے جسم کی ایسی صفائی ہوجاتی ہے کہ وہ نئی توانائیوں کے ساتھ قبول غذا اور افعال معمولہ کے لیے تیار ہوجاتے ہیں۔روزے سے ایک فائدہ یہ بھی حاصل ہوتا ہے کہ اعضائے رئیسہ یعنی دل ودماغ اور جگر کو آرام مل جاتا ہے اور اس آرام سے ان کی کارکردگی میں بہتری اور اضافہ ہوجاتا ہے''۔(۲۹)

روزہ اور نظام تولید: نظام تولید (reproductive system) نسل انسانی کے تسلسل کا ذریعہ ہے۔اللہ تعالیٰ نے مخالف جنس میں کشش پیدا کرکے اس کو فطرت سے ہم آہنگ کردیا ہے لیکن مرد اور عورت کی باہمی کشش کو نکاح کے ضابطے سے مشروط کردیا۔جنسی محرک ان فطری محرکات

میں سے ہے جو اپنی تکمیل کے لیے انسان پر بہت دباؤ ڈالتے ہیں۔

روزہ جنسی محرک کے دباؤ اور اس سے پیدا ہونے والی نفسیاتی کشمکش کو کم کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ روزہ کی وجہ سے جنسی محرک کمزور پڑ جاتا ہے۔ ایک طرف تو غذا کی قلت کی وجہ سے اور دوسری طرف روزہ کے دوران اللہ کی عبادت، ذکر و تسبیح میں مشغول ہونے کی وجہ سے، اس کا ذہن جنسی موضوع پر غور و فکر سے ہٹ جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے نوجوانوں کو شادی کی ترغیب دی ہے اور جن نوجوانوں میں شادی کی استطاعت نہ ہو، انہیں روزہ کی ترغیب دی ہے۔ (۳۰)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''اے نوجوانوں کی جماعت! تم میں سے جو لوگ اخراجات نکاح کی طاقت رکھتے ہوں، وہ نکاح کر لیں، کیونکہ نکاح سے نگاہ اور شرم گاہ دونوں کی حفاظت ہوتی ہے اور جن میں اخراجات نکاح کا تحمل نہ ہو وہ روزہ رکھیں، کیونکہ روزہ ان کی شہوت پر کنٹرول کرے گا''۔ (۳۱)

یہاں اس امر کا تذکرہ بھی ضروری ہے کہ روزہ رکھنے سے انسان کے جنسی نظام پر کسی قسم کے مضر اثرات مرتب نہیں ہوتے۔ اس سے جنسی محرک کو کنٹرول کرنے میں مدد ضرور ملتی ہے لیکن نظام تولید میں کسی قسم کا نقص پیدا نہیں ہوتا۔ یونیورسٹی آف میڈیکل سائنسز تہران میں ڈاکٹر ایف عزیزی اور ان کے رفقاء نے روزے کے اثرات کے سائنسی مطالعہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اس سے تولیدی ہارمون پر کسی قسم کے منفی اثرات ظاہر نہیں ہوتے۔ ایران کی یونیورسٹی آف میڈیکل سائنسز، تہران کے ڈاکٹر عزیزی اور ان کے رفقاء نے تحقیق کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے:

"intermittent abstinence from food and drink for 17 hours a day for 29 days does not alter male reproductive hormones, hypothalamic-pituitary-thyroid axis or peripheral metabolism of thyroid hormones and physicians caring for Muslims should be aware of changes of glucose and bilirubin during Ramadan". (۳۲)

روزہ اور نظام اعصاب: جسم انسانی ایک نہایت پیچیدہ اور متحرک دنیا ہے جس میں

کروڑوں ذی حس خلیات اپنے اپنے کاموں میں مشغول رہتے ہیں۔ ہزاروں کمپیوٹر مستعدی سے برسرکار ہیں، بہت سی فیکٹریاں چل رہی ہیں۔ لاتعداد اجزائے خوراک، رطوبتیں، لعاب اور ہارمون، جسمانی صحت کے تقاضے پورے کرر ہے ہیں۔ قسم قسم کی شریانیں نہروں کی طرح رواں دواں ہیں۔ حواس خمسہ کے لیے برقی تار جسم کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ درحقیقت انسانی جسم خداوند تعالیٰ کا ایک بڑا کرشمہ ہے اوراس کی ذات اور صفت خلاقیت کا بین اور لاریب ثبوت ہے۔ ان سب پیچیدہ کارگزاریوں کا کنٹرول ہمارے دماغ کے خلیات میں ہے جن کا اپنا ضبط ونسق ذہن انسانی کی ذمہ داری ہے۔ ثابت ہوا کہ ذہن انسانی ہی اصل کلید صحت ہے۔ ذہن بہت سے جذبات سے متاثر ہوتا ہے مثلاً خوشی، غم، غصہ، نفرت، بے چینی، سکون، مایوسی اور فکر وغیرہ، جن لوگوں کی قوت ارادی مضبوط ہوتی ہے اوران کو صبر کی عادت ہوتی ہے وہ ان جذبات کا اثر بہت حد تک ذہن تک ہی محدود رکھتے ہیں۔ جسم کے خلیات پر ان جذبات پر اثر انداز نہیں ہونے دیتے۔ متلون مزاج اور حد سے زیادہ حساس افراد میں ان جذبات کا اثر بہت سے خلیات کے افعال پر منتقل ہوتا رہتا ہے اور پھر بیشتر امراض کا موجب بن جاتا ہے مثلاً معدے، چھوٹی و بڑی آنت کے زخم، دمہ، جوڑوں کی سوزش، فالج ودل کے دورے وغیرہ۔ روز بروز اس فہرست میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ ہر بیماری میں ذہنی اثرات مزید پیچیدگیاں پیدا کردیتے ہیں۔ قوت ارادی وصبر ان بیماریوں کے بچاؤ میں اور ہر بیماری کے علاج میں جسمانی قوت مدافعت کو استوار کرتے ہیں۔ روزہ ان دونوں خوبیوں کو انسان میں پیدا کرتا ہے اور سال بہ سال ان کی افزائش کرتا ہے۔ (۳۴)

ڈاکٹر ہلوک نور باقی کے مطابق روزے کے دوران ہماری جنسی خواہشات چونکہ علاحدہ ہوجاتی ہیں۔ اس وجہ سے بھی ہمارے اعصابی نظام پر منفی اثرات مرتب نہیں ہوتے۔ روزہ...... سے دماغ میں دوران خون کا بے مثل توازن قائم ہوجاتا ہے جو صحت مند اعصابی نظام کی نشان دہی کرتا ہے۔ اندرونی غدود کو جو آرام اور سکون ملتا ہے، وہ پوری طرح سے اعصابی نظام پر اثر انداز ہوتا ہے.......... انسانی تحت الشعور جو رمضان کے دوران عبادت کی مہربانیوں کی بدولت صاف، شفاف اور تسکین پذیر ہوجاتا ہے اعصابی نظام سے ہر قسم کے تناؤ اور الجھن کو دور کرنے میں مدد

دیتا ہے۔(۳۴)

روزہ اور انسانی نفسیات: لندن یونیورسٹی سے فارمیسی کی تعلیم حاصل کرنے والے محمد فاروق کمال رقم طراز ہیں:

''نفسیاتی طور پر انسان پر روزے کا بہت ہی اچھا اثر پڑتا ہے روزہ اللہ تعالیٰ سے مستقل و مسلسل لگاؤ کا ذریعہ ہے۔ سارا وقت اللہ کا تصور انسان کے ذہن میں رہتا ہے جو اسے تنہائی میں بھی کھانے، پینے اور برائی سے مانع ہوتا ہے۔ یہ ہمہ وقت تصور الٰہی انسان میں اعتماد اور امید پیدا کرتا ہے اور انسان خود کو اکیلا نہیں بلکہ ہمیشہ اللہ رحیم و رحمٰن کی معیت میں محسوس کرتا ہے اور اپنی مشکلات کے لیے پریشان نہیں رہتا بلکہ اللہ پر بھروسہ اسے ذہنی سکون مہیا کرتا ہے''۔(۳۵)

ایک حدیث مبارکہ میں روزے کو ڈھال قرار دیا گیا ہے:

الصوم جنة ۔(۳۶)

ڈاکٹر محمد عثمان نجاتی کے مطابق ڈھال ہونے کا مطلب یہ ہے کہ روزہ خواہشات نفس سے بچاتا ہے۔ روزے دار اپنی خواہشات پر کنٹرول کرتا ہے، نہ کھاتا ہے نہ پیتا ہے نہ جماع کرتا ہے اور اپنے طرز زندگی پر بھی کنٹرول کرتا ہے، نہ فحش گوئی کرتا ہے نہ شور وغل مچاتا ہے اور نہ ہی سب وشتم کرتا ہے۔ نہ کوئی ایسا کام کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کو غضب ناک کرے۔ روزوں میں خواہشات اور تاثرات پر قابو پانے کی مشق ہو جاتی ہے اور نفس کے فاسد میلانات اور خواہشات پر غلبہ پانے کے سلسلے میں عزم وارادے کو قوت پہنچتی ہے۔(۳۷)

معروف مصری اسکالر محمد قطب روزہ کو شعوری انضباط کی بہترین مثال قرار دیتے ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ عمل انضباط ایک نفسیاتی ورزش ہے۔ جو متعدد پہلوؤں میں جسمانی ورزش سے مشابہت رکھتی ہے۔ دونوں ہی قسم کی ورزشیں ابتداً دشوار محسوس ہوتی ہیں مگر عادت ہو جانے پر ان کی مشقت کم ہوتی چلی جاتی ہے اور اگر شروع سے عادت ڈال لی جائے تو نہ صرف یہ کہ سہل ہو جاتی ہے بلکہ اس پر پوری پوری قدرت بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ اسی لیے اسلام چاہتا ہے کہ بچے کو ابتدائی سالوں ہی سے تربیت دی جائے اور اسے خواہشوں کے ضبط کرنے کی عادت ڈالی

جائے۔(۳۸)

بعض لوگ انتہائی آرام طلب ہوتے ہیں۔ وہ جسم کو تکلیف دینا پسند نہیں کرتے اور بھوک، پیاس اور جنسی خواہشات کی تکمیل لازم سمجھتے ہیں۔ حالانکہ انضباط سے جو تکلیف پہنچتی ہے، انسانی طاقت سے ہرگز ماورا نہیں ہوتی بلکہ انسان اس کو پسند نہیں کرتا۔ ماہرین نفسیات کہتے ہیں کہ انسانی نفس میں الم ومصیبت برداشت کرنے بلکہ اس سے لطف اندوز ہونے کا مادہ ہے۔ اس لیے انسان روزے کے دوران بھوک، پیاس یا ضعف بدن سے ایک خاص لذت محسوس کرتا ہے۔ روزہ احساس گناہ (guilt complex) اور اس سے پیدا ہونے والے قلق واضطراب کا بھی مفید علاج ہے۔ چونکہ قرآن پاک میں روزے کا بنیادی مقصد ہی تقویٰ بتایا گیا ہے، اس لیے یہ انسان کو خوف اور حزن سے پیدا ہونے والے نفسیاتی عوارض سے بھی محفوظ رکھتا ہے۔ روزے رکھنے سے گناہ معاف ہوتے ہیں اور آخرت کی زندگی کے بارے میں خوف کی بجائے امید پیدا ہو جاتی ہے، جس سے ایک مسلمان کو قلبی سکون کی دولت میسر آتی ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ کے ارشادات کے مطابق روزہ گناہوں سے مغفرت کا ذریعہ ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

من صام رمضان ایمانا و احتسابا غفر له ما تقدم من ذنبه ۔(۳۹)	جس شخص نے رمضان کے روزے حالتِ ایمان میں خالص اللہ کی رضاجوئی کے لیے رکھے، اس کے پچھلے گناہ بخش دیے جاتے ہیں۔

روزہ اور تندرست افراد کی جسمانی کارگزاری: عصر حاضر میں کچھ لوگ بالکل تندرست ہونے کے باوجود روزے نہیں رکھتے حالانکہ تندرست افراد کی جسمانی کارگزاری پر روزے کے کسی قسم کے منفی اثرات کسی طبی مطالعہ میں سامنے نہیں آئے۔ البتہ مثبت اثرات کا پتا چلا ہے۔ ڈاکٹر سید محمد اسلم لکھتے ہیں کہ تندرست افراد میں روزہ کے دوران جسم کی اندرونی توازن رکھنے والی کارگزاری پر کوئی قابل ذکر اثر نہیں پڑتا اور وہ پیشاب کے نمکیات، تیزاب اور القلی کا میزان اور نائٹروجن کا اخراج معمول کی حدود میں رہتا ہے۔ روزہ کے دوران ٹوٹ پھوٹ کے عمل سے خون میں یوریا اور یورک تیزاب کی مقدار میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہ تبدیلیاں گوشت خوروں میں زیادہ

نمایاں ہوتی ہیں۔ اگر رمضان المبارک میں افطار کے وقت زیادہ شکر، روٹیاں، چاولو غیرہ کھایا جائے تو اس کا اثر مختلف ہوگا، یعنی خون میں شکر کم ہوسکتی ہے، لیکن اگر غذا معمول کے مطابق رکھی جائے اور سحری اچھی طرح کی جائے تو خون میں تفریط شکر کا کوئی امکان نہیں۔ (۴۰)

گذشتہ زمانے میں لوگ بہت زیادہ جسمانی مشقت کرتے تھے لیکن موجودہ دور کے انسان میں اس صفت میں کمی آگئی ہے، جس کے باعث موٹاپے نے متمول افراد کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ چکنائی اور نشاستہ دار غذاؤں کا بے ہنگم استعمال عام ہوگیا ہے جو بغیر جسمانی مشقت کے غیر استعمال شدہ حالت میں جسم میں جمع ہوتی رہتی ہیں اور وزن بڑھتا چلا جاتا ہے۔ جو افراد مختلف جدید طریقوں سے وزن کم بھی کر لیتے ہیں، وہ جب نارمل زندگی گذارنے لگتے ہیں تو وزن پھر بڑھ جاتا ہے۔ دراصل انسانی دماغ کے ہائپو تھیلمس (hypothalamas) میں ایک سنٹر ہوتا ہے جسے لپوسٹیٹ (lipostat) کہتے ہیں یہ انسان کی جسامت کو کنٹرول کرتا ہے۔ جب بھی خوراک کی انتہائی کمی سے وزن تیزی سے کم کیا جاتا ہے تو یہ سنٹر اس تبدیلی کو قبول نہیں کرتا اور جسم کے وزن کو دوبارہ معمول کی خوراک، لینے سے پہلے والی سطح پر واپس لے آتا ہے۔ (۴۱) اس لیے یہ ضروری ہے کہ موٹاپا دور کرنے کے لیے وزن آہستہ آہستہ کم کیا جائے تاکہ lipostat اسے قبول کرلے اور ایسا ماہ رمضان کے دوران ایک ماہ کے روزے رکھنے سے بآسانی کیا جاسکتا ہے۔

۱۹۹۴ء میں "Health and Ramadan" کے عنوان سے پہلی انٹرنیشنل کانگریس کیسابلانکا (Casablanca) میں منعقد ہوئی جس میں اس موضوع پر ۵۰ تحقیقی مقالات پیش کیے گئے۔ (۴۲)

روزہ اور بیماری: قرآن پاک میں بیمار اور مسافر کو روزہ قضا کرنے کی اجازت دی گئی ہے اور جو روزہ رکھنے کی بالکل طاقت نہ رکھتا ہو، خواہ بڑھاپے کے باعث یا مستقل بیماری کی وجہ سے، اسے فدیہ دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

فَمَنْ كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ ۔ (۴۳)	پھر جو تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو اتنے روزے اور دنوں میں رکھ لے اور جو لوگ اسے بہت مشکل سے ادا کرسکیں، وہ ایک مسکین کا کھانا فدیہ دیں۔

قرآن مجید نے قیامت تک آنے والے مسائل کا حل پیش کیا ہے یا پھر ایسے راہنما اصول وضع کردیے ہیں جن کے ذریعے تمام ادوار کے پیش آمدہ مسائل کا حل تلاش کیا جاسکے۔ روزے سے متعلق بھی احکام خداوندی میں بتایا گیا کہ روزہ رکھو یہ تمہاری بہت سی جسمانی ونفسیاتی بیماریوں کا علاج ہے یا ان امراض کے خلاف جسمانی قوت مدافعت بڑھاتا ہے۔ پھر یہ حکم دیا کہ جنہیں عارضی مسئلہ درپیش ہے جیسے اگر سفر پر جانا ہے یا پھر کوئی جسمانی عارضہ لاحق ہے تو اس عارضی رکاوٹ کے ختم ہونے کے بعد روزے پورے کرلو۔ یہی حکم خواتین کے مخصوص ایام کے متعلق بھی ہے لیکن اگر کوئی شخص انتہائی بڑھاپے اور کمزوری کے باعث یا پھر کسی ایسی بیماری کے باعث جو بخار وغیرہ کی طرح وقتی نہیں ہے بلکہ مستقلاً انسان کو لگ گئی ہے اور روزہ رکھنے سے اس میں شدت کا اندیشہ ہے تو ایک مسکین کو کھانا بطور فدیہ دینا ہوگا۔

موجودہ دور میں سائنس نے بہت ترقی کرلی ہے۔ طبی تحقیقات کے باعث ہر قسم کی بیماری کو کم یا زیادہ کرنے والے عوامل سامنے آچکے ہیں۔ اس لیے مختلف بیماریوں میں مبتلا افراد کو ماہرین طب کے مشورے پر عمل کرنا چاہیے۔ ڈاکٹر سید اسلم (۴۴) اور ڈاکٹر شاہد اطہر (۴۵) نے مختلف بیماریوں کے روزے رکھنے یا نہ رکھنے کے بارے میں تفصیلاً بتایا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:

۱- ذیابیطس کے مریض جو انسولین (insulin) استعمال کرتے ہیں، انہیں روزے نہیں رکھنے چاہیے کیونکہ ان کی ذیابیطس کو قابو میں رکھنا مشکل ہوجائے گا۔ اس کے برعکس انسولین نہ لینے والے مریضوں کو ان مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ ایسے مریض جو صرف خوراک سے ذیابیطس کو کنٹرول کررہے ہیں، وہ روزہ رکھ سکتے ہیں ان کے مرض پر روزہ اچھے اثرات مرتب کرتا ہے۔

۲- دمہ کے مریض جن کا مرض معمولی ہے، وہ تکلیف کی صورت میں بغیر روزہ توڑے سانس کے ساتھ والی ادویہ (inhaler) استعمال کرسکتے ہیں یا دیرپا اثر والی دوائیں افطار کے بعد اور سحری سے قبل لے سکتے ہیں۔

۳- بلند فشار خون (High Blood Pressure) اور دل کے ایسے مریض، جو خون پتلا کرنے والی ادویہ استعمال کررہے ہیں، ان کے لیے طویل الاثر دوا کفایت کرسکتی ہے اور وہ روزہ

رکھ سکتے ہیں۔ کیونکہ روزے سے وزن میں کمی واقع ہوگی اور بلڈ پریشر بھی کم رہے گا۔ تاہم ان مریضوں کو ڈاکٹر کے مشورے سے روزہ رکھنا چاہیے لیکن شدید ہائپر ٹینشن اور امراض قلب میں مبتلا مریضوں کو روزہ نہیں رکھنا چاہیے۔

۴- جن لوگوں کے گردوں کے فعل میں کمی آگئی ہے، ان میں روزہ رکھنے سے پانی کی کمی ہوسکتی ہے۔ جن مریضوں کے گردے خراب ہو چکے ہیں اور ان کے خون کی ڈایالیسس (dialysis) ہوتی رہتی ہے، ان میں دو ڈایالیسس کے درمیانی وقفہ میں پوٹاشیم میں اضافہ اور وزن میں زیادتی ہوسکتی ہے، جسم کے تیزاب میں بھی اضافہ کا امکان ہے۔ اگر یہ لوگ رات کو زیادہ کھالیں گے تو وزن بڑھ کر نقصان دہ ہوسکتا ہے۔ ان افراد کو روزے نہیں رکھنے چاہئیں جن کا گردہ تبدیل ہو چکا ہے اور اس کا فعل درست ہے، ان کو روزے سے کوئی ضرر نہیں پہنچتا لیکن انہیں اپنے معالج سے مشورہ کر لینا چاہیے۔

۵- مرگی کے مریضوں کو روزہ نہ رکھنے کا مشورہ دیا جاتا ہے۔

۶- درد گردہ اور معدہ کے السر میں مبتلا افراد کے لیے روزے رکھنا مناسب نہیں کیونکہ پانی کی کمی کے باعث گردے میں درد ہونے کا احتمال ہے۔ اسی طرح السر کے مریض بھی خالی معدے کی حالت میں زیادہ تکلیف سے دوچار ہوسکتے ہیں۔

۷- بوڑھے افراد جو دماغ کی رگوں کے مرض میں مبتلا ہیں، ان میں روزے سے اشیاء کو شناخت کرنے کی صلاحیت گھٹ سکتی ہے۔

۸- حاملہ اور دودھ پلانے والی عورتیں روزے نہ رکھیں کیونکہ حاملہ خواتین میں خون کی گلوکوز اور انسولین میں کمی ہوجاتی ہے۔ دودھ پلانے والی خواتین کے جسم میں پانی کی کمی ہوسکتی ہے۔ نمک اور یورک ایسڈ میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ ماں کے دودھ کی لیکٹوز (شکر)، سوڈیم اور پوٹاشیم میں تبدیلی آجاتی ہے۔ اس لیے بچے کی صحت قائم رکھنے کے لیے روزہ نہ رکھا جائے۔

حواشی

(۱) الاعراف ۷:۳۱۔ (۲) صحیح بخاری، کتاب اللباس، باب ۵۴۰۴۵، پہلی حدیث۔ (۳) محمد عثمانی نجاتی، ڈاکٹر۔

حدیث نبویؐ اور علم النفس۔ مترجم فہیم اختر ندوی۔ (لاہور: الفیصل ناشران وتاجران کتب، اردو بازار، س۔ن) ص ۵۱۔ (۴) البقرہ ۲: ۱۸۳۔ (۵) البقرہ ۲: ۱۸۴۔ (۶) مجمع الزوائد، ج ۵، ص ۳۴۴؛ کنز العمال، رقم الحدیث ۲۳۶۰۵۔ (۷) حکیم محمد سعید۔ عرفانستان (کراچی ہمدرد فاؤنڈیشن پریس، ۱۹۹۲ء) ص ۱۷۵۔ (۸) یہ حدیث مبارکہ حضرت سہل بن سعدؓ نے روایت کی ہے (المعجم الکبیر ۶: ۲۳۸) حضرت ابوہریرہؓ سے بھی یہ حدیث مروی ہے (ملاحظہ ہو: سنن ابن ماجہ، کتاب الصیام، باب فی الصوم زکاۃ الجسد، حدیث ۱۷۴۵)۔

(۹) محمد کمال الدین حسین ہمدانی، ڈاکٹر حکیم سید۔ اسلامی اصول صحت (علی گڑھ: حی علی الفلاح سوسائٹی، اشاعت اول ۱۴۰۵ھ/۱۹۸۵ء) ص ۴۲۔ (۱۰) ابن قیم۔ طب نبویؐ۔ مترجم حکیم عزیز الرحمان اعظمی (لاہور: فاروقی کتب خانہ، اگست ۱۹۹۳ء) ص ۶۱۴۔ (۱۱) محمد عالم گیر خان، ڈاکٹر۔ اسلام اور طب جدید (لاہور: ۱۹۷۳ء) ص ۱۲۔ (۱۲) ہلوک نور باقی، ڈاکٹر۔ قرآنی آیات اور سائنسی حقائق۔ مترجم سید محمد فیروز شاہ (کراچی: انڈس پبلشنگ کارپوریشن، ۱۹۹۰ء) ص ۱۰۳۔

(۱۳) Karimullah, Amina and A.R. Ghani, "Ramadan Fasting: Medical and Physical Aspects", Science and Technology in the Islamic World, vol.11, No.1, (1993) p.11.

(۱۴) محمد عالم گیر خان، ڈاکٹر۔ اسلام اور طب جدید، ص ۱۳۔ (۱۵) محمد فاروق کمال۔ سیرت محمد رسول اللہؐ (لاہور: ڈیفنڈر آف اسلام ٹرسٹ، ۲۸۔ ایمپرس روڈ، اکتوبر ۱۹۹۷ء) ص ۵۸۰۔

(۱۶) Haluk Nurbaki, Dr. Verses from the Holy Koran and the Facts of Science, English Translation by Metin Beynam (Karachi: Indus Publishing Corporation, 1992) pp.119-120.

(۱۷) ہمدانی۔ اسلامی اصول صحت، ص ۴۳-۴۴۔

(۱۸) Shahid Athar (ed) Islamic Medicine (Karachi: Pan-Islamic Publishing House, 1989) p148.

(۱۹) ہلوک نور باقی۔ قرآنی آیات اور سائنسی حقائق، ص ۱۰۵-۱۰۶۔ (۲۰) محمد سعید، حکیم۔ عرفانستان، ص ۱۶۹-۱۷۰۔ (۲۱) محمد فاروق کمال۔ سیرت محمد رسول اللہؐ، ص ۵۸۰-۵۸۱۔

(۲۲) Abdullah A. Al-Othman, The influence of Ramadan on Plasma Lipids and Body Weight in Normal Men; JIMA, vol:28,No:1, p5/ MAAS Journal of Islamic Science,

vol:13,No:1,1997,p165.

(۲۳) ہمدانی ۔ اسلامی اصول صحت، ص ۴۴۔

(۲۴) Shahid Athar, Islamic Medicine, p 150.

(۲۵) ہلوک نور باقی ۔ قرآنی آیات اور سائنسی حقائق، ص ۱۰۶۔ (۲۶) ایضاً، ص ۱۰۷ - ۱۰۸۔ (۲۷) محمد فاروق کمال ۔ سیرت محمد رسول اللہؐ ص ۱۸۵۔ (۲۸) محمد عالم گیر خان ۔ اسلام اور طب جدید، ص ۱۳۔ (۲۹) محمد سعید، حکیم ۔ عرفانستان، ص ۱۷۲۔ (۳۰) محمد عثمان نجاتی، ڈاکٹر ۔ حدیث نبویؐ اور علم النفس، ص ۵۳۔ (۳۱) صحیح بخاری، حدیث ۵۰۶۵/ ابوداؤد، حدیث ۲۰۴۶/ مسند احمد، حدیث ۱: ۴۴۷۔

(۳۲) Shahid Athar, Islamic Medicine, p 148-149.

(۳۳) محمد عالم گیر خان ۔ اسلام اور طب جدید، ص ۱۲-۱۳۔ (۳۴) ہلوک نور باقی ۔ قرآنی آیات اور سائنسی حقائق، ص ۱۰۷۔ (۳۵) محمد فاروق کمال ۔ سیرت محمد رسول اللہؐ ص ۱۸۵۔ (۳۶) صحیح مسلم مع نووی، ج ۲، حدیث ۱۲۱۶/۱۔ (۳۷) محمد عثمان نجاتی، ڈاکٹر ۔ حدیث نبویؐ اور علم النفس، ص ۳۴۹۔ (۳۸) محمد قطب مصری ۔ اسلام اور جدید مادی افکار ۔ اردو ترجمہ سجاد احمد کاندھلوی (لاہور: اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ، اشاعت دوم اپریل ۱۹۸۱ء) ص ۱۷۵-۱۷۶۔ (۳۹) صحیح البخاری، کتاب الصوم، باب من صام رمضان ایمانا واحتسابا و نیة، حدیث ۱۹۰۱، یہ روایت مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور مسند احمد میں بھی موجود ہے۔ (۴۰) سید اسلم، ڈاکٹر ۔ صحت سب کے لیے (اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان پاکستان، جنوری ۱۹۹۹ء)، ص ۴۲۵-۴۲۶۔

(۴۱) Shahid Athar, Islamic Medicine, p149.

(۴۲) www.islam-usa.com

(۴۳) البقرہ ۲: ۱۸۴۔ (۴۴) سید اسلم، ڈاکٹر ۔ صحت سب کے لیے، ص ۴۲۶۔

(۴۵) Shahid Athar, Islamic Medicine, p150-151. -

اخبار علمیہ

کناڈا کے روزنامہ ''وینکوور سن'' کے مطابق مراکش نژاد عالمی شہرت یافتہ سائنس داں اور ماہر فلکیات رعدوین الفقیر نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے خلاف اٹھائے جانے والے سوالات اور توہین آمیز خاکوں سے انتہائی پریشان ہیں اور معاندین کی باتوں کا جواب چاند پر ایک خلائی اسٹیشن بنا کر دینا چاہتے ہیں۔اس منصوبہ کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے وہ اسلامی ملکوں کے سربراہوں اور متمول افراد کی امداد کے خواہاں ہیں جس کا تخمینہ سو ملین ڈالر ہے، ۲۰۱۳ء میں ''محمد 1'' کے نام سے ایک جدید سائنسی لیباریٹری چاند پر بھیجنے کا ان کا پروگرام ہے، ۲۰۱۵ء میں ایک اور لیباریٹری بھیج کر اور اعلیٰ درجے کی جدید ترین ٹیلی اسکوپ نصب کر کے اپ گریڈ کیا جائے گا، اس سائنسی لیب کے اخذ کردہ نتائج اور تفصیلات انٹرنیٹ پر مفت دستیاب ہوں گے، ۱۰؍ستمبر ۲۰۱۰ء کو وہ اس سلسلہ کی ایک اہم کانفرنس کناڈا میں کرنے والے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی شان میں گستاخی کا سلسلہ دراز ہوتا جا رہا ہے جس کے پس پشت یہ خیال بھی ہے کہ دین محمدی ﷺ سائنسی ترقی، تعلیم اور تحقیق کی راہ میں رکاوٹ ہے۔اپنے منصوبہ سے وہ بتانا چاہتے ہیں کہ اسلام تحقیق کی راہ میں رکاوٹ نہیں بلکہ معاون ہے، ''محمد شمس ا'' لیباریٹری کو چاند پر کامیابی کے ساتھ بھیجنے کے بعد رعدوین الفقیر ''محمد شمس II'' ۲۰۱۵ء میں خلا میں روانہ کریں گے، قطر کے مشہور اخبار ''العرب'' نے بھی اس عظیم سائنس داں کے حالات اور منصوبوں کو شائع کیا ہے جس کے مطابق رعدوین، ابن الہیثم سے متاثر اور اسلامی تاریخ کا بے حد احترام کرتے ہیں اور مسلمان سائنس دانوں کو آگے بڑھانا چاہتے ہیں، انہوں نے اپنے آبائی وطن کاساپلانکا میں فلکیاتی علوم کا ایک مرکز بھی کھولا ہے جہاں سینکڑوں مسلم طلبا خلائی ٹکنالوجی کا علم حاصل کر رہے ہیں۔

گلف نیوز کی اطلاع کے مطابق سعودی وزارت انصاف کے مشیر شیخ العبیکان نے ایک مضحکہ خیز فتوی میں کہا ہے کہ جو عورتیں ملازمت یا کسی اور وجہ سے برابر مردوں کے رابطہ میں رہتی

ہیں وہ انہیں عمل شیر خوارگی کے ذریعہ اپنا محرم بنا سکتی ہیں۔ اس طرح اسلامی قوانین کی خلاف ورزی نہ کرتے ہوئے مردان کے لیے محرم ہو جائیں گے، اس غیر معقول اور سراسر غیر شرعی فتوی کی حمایت ایک اور عالم دین ابواسحاق الجوینی نے بھی کی ہے، اس کے علاوہ ایک جز ہے کہ امام حرم اور سعودی عالم عادل الکلبان نے موسیقی کے متعلق یہ غیر ذمہ دارانہ فتوی دیا ہے کہ چونکہ قرآن مجید میں موسیقی کی حرمت کا کہیں واضح طور پر ذکر نہیں ہے اس لیے اس سے شغف اور دلچسپی میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ سعودی حکومت اس قسم کی نامناسب فتوی بازی کے خلاف سخت قوانین بنانے پر غور کر رہی ہے۔

امریکی جرنل "Epidemiology" میں کہا گیا ہے کہ زیادہ دیر تک ایک جگہ بیٹھنا جان لیوا امراض کا سبب ہوسکتا ہے، ۵۳۴۴۰ مرد اور ۶۹۷۷ ایسی خواتین کو اس جائزہ میں شامل کیا گیا جنہیں بعض موذی امراض کینسر یا بلڈ پریشر وغیرہ کا شائبہ تک نہیں تھا۔ اس تحقیق سے معلوم ہوا جو خواتین ۶ - ۶ گھنٹے ایک جگہ بیٹھتی ہیں، ان کے مقابلہ میں ۳ر گھنٹہ بیٹھ کر وقت گزارنے والی عورتوں میں ۳۷ فیصد جان لیوا امراض کے خطرات کم پائے گئے، اسی طرح زیادہ بیٹھنے والے مردوں کے مقابلے میں کم بیٹھنے والے مردوں میں اس کی شرح ۱۸ فیصد کم تھی۔

انڈونیشیا میں ۳۷ملین مسلمان ہیں، لیکن ایک جائزہ کے بعد معلوم ہوا کہ وہاں کے مسلمان اب تک سمت قبلہ میں غلط تھے اور بیت اللہ کے بہ جائے ان کا رخ کینیا اور صومالیہ کی طرف ہوتا تھا، اس لیے وہاں کے مشہور و معروف ادارہ علماء کونسل کے ممتاز عالم معروف امین نے نمازیوں سے تصحیح قبلہ کی اپیل کرتے ہوئے کہا ہے کہ صحیح رخ شمال مغرب ہے اور اب اسی کا التزام کیا جانا چاہیے، اب تک تعیین قبلہ کی تصحیح نہ ہونے سے پڑھی گئی نمازوں کا کوئی اثر نہیں ہوگا، یہ نادانستہ غلطی تھی جس کو اللہ تعالیٰ ضرور معاف فرمائے گا۔

روس کے شہر Chelyabinsk میں ۶ میٹر لمبی اور تین میٹر چوڑی Hero Book نامی کتاب شائع کی گئی ہے، اس میں دوسری جنگ عظیم کے دوران مرنے والوں کے حالات ہیں، اس کتاب کا وزن ۶۰ کلوگرام ہے، مرنے والوں کی تصویروں کے ساتھ ساتھ ان کی جرأت و شجاعت کے

کارناموں کو بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے ملک کے لیے اپنی جانوں کے نذرانے کیوں پیش کیے؟

چینی سفارت خانہ سے جاری ایک بیان میں کہا گیا ہے کہ وہاں کی سرزمین اسلام کی کرنوں سے خلیفہ ثالث حضرت عثمان غنیؓ کے عہد خلافت میں مستنیر ہوئی، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ جب چین پہنچے تو وہاں شہنشاہ نے ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا اور ملک میں پہلی مسجد تعمیر کرنے کی اجازت دی، پھر تیرہویں چودہویں صدی میں سلطنت یوان کے عہد میں مسلمانوں کی کثیر تعداد منتقل ہوئی اور چین میں اسلامی تہذیب وثقافت کا فروغ ہوتا رہا، چین کے زیر انتظام ننینگژیا اور ژنجیانگ یغور میں مسلمانوں کی اکثریت ہے، مجموعی طور پر سرکاری اعداد وشمار کے مطابق اس وقت چین میں دو کروڑ مسلمان آباد ہیں۔

عام خیال ہے کہ انسان اپنے دماغ کا زیادہ سے زیادہ ۲ فیصد حصہ ہی استعمال کر پاتا ہے تاہم جدید ایم آر آئی کی تصویروں سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان دماغ کا بیش تر حصہ ہر وقت استعمال کر رہا ہوتا ہے، حتی کہ سونے میں بھی دماغ کا بڑا حصہ مصروف عمل رہتا ہے۔

کیمبرج یونیورسٹی کے ایک گریجویٹ ولیم جیکس کو کتابوں کی چوری کے الزام میں سزا دی گئی ہے، رپورٹ کے مطابق اس نے برطانیہ کے مختلف کتب خانوں سے دس لاکھ پونڈ مالیت سے زائد کی پانچ سو کتابوں کا سرقہ کیا ہے، ۴۱ سالہ جیکس کو اس سے پہلے بھی پانچ سو کتابوں کے سرقہ کے الزام میں ۸ برس کی سزا ہو چکی ہے۔

امریکی اخبار ''کرسچین سائنس مانیٹر'' کی اطلاع کے مطابق خواتین میں تمباکو نوشی کی شرح میں اضافہ ہوا ہے، پوری دنیا میں تمباکو نوشی سے سالانہ پچاس لاکھ اموات ہو رہی ہیں جو ۲۰۳۰ء تک ۸۰ لاکھ سے تجاوز کر جائیں گی، عالمی ادارہ صحت کے جائزے میں کہا گیا ہے کہ ان سگریٹ نوشوں میں خواتین کی شرح ۲۰ فیصد ہے، ترقی پذیر اور پسماندہ دونوں جگہ تمباکو نوشی کی تعداد میں یہ اضافہ تشویش ناک اور حیرت انگیز ہے۔

ک، ص اصلاحی

معارف کی ڈاک

خواجہ گنج شکر و خواجہ نظام الدین اولیاء......

مدینہ منزل،

نیو سر سید نگر، علی گڑھ

۱۶؍ جون ۲۰۱۰ء

مکرمی و محترمی مولانا عمیر الصدیق ندوی زید مجدہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا!

رسالہ معارف شمارہ مارچ ۲۰۱۰ء نظر سے گذرا۔ اس میں جناب فیروز الدین احمد فریدی کا مقالہ ''فریدالدین مسعود گنج شکر اور خواجہ نظام الدین اولیاء کے باہمی تعلقات پر ایک نظر'' میں نے پڑھا اور مجھے بڑا تعجب ہوا کہ معارف جیسے معروضی و محققانہ انداز نظر رکھنے والے رسالہ میں یہ مقالہ کیسے شائع ہوگیا۔ پورا مقالہ تو ہم پرستی کا آئینہ ہے خصوصاً مقالہ نگار کا واضح ادّعا یہ ہے کہ حج کے شوق کے لیے کعبہ جانے کی ضرورت نہیں بلکہ جب بھی حضرت نظام الدین نے اجودھن جاکر شیخ فریدالدین کی قبر پر حاضری دی تو حج کی دولت بھی حاصل ہوگئی اور اس سے بھی زیادہ حاصل ہوگیا۔ ایسے مفاہیم جو شریعت کے مخالف اور متضاد ہوں ان کو بغیر نوٹس کے شائع نہ کیا جائے۔ یہاں میں یہ آخری پیراگراف نقل کرتا ہوں:

> ''شیخ الاسلام فریدالدین قدس اللہ سرہ العزیز کے انتقال کے بعد مجھ پر حج کے شوق نے بہت غلبہ کیا۔ میں نے کہا کہ پہلے اجودھن جاکر شیخ کی زیارت سے تو مشرف ہولوں۔ شیخ کی زیارت ہوئی تو میرا مقصد مجھے مل گیا بلکہ کچھ زیادہ ہی ملا۔ اس

کے بعد ایک بار پھر خواہش ابھری، میں پھر شیخ کی زیارت کے لیے اجودھن پہنچ گیا اور مقصود پھر حاصل ہوگیا"۔ (معارف مارچ ۲۰۱۰ء، ص ۲۳۳)

اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ حج کے لیے مکہ مکرمہ اور کعبہ جانے کی ضرورت نہ رہی۔ مقصود یعنی حج اجودھن میں حاصل ہوگیا۔ ایسے بیانات شریعت کی روح کے خلاف ہیں۔ مقالہ نگار صاحب نہایت توہم پرستانہ عقائد میں مبتلا ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ وہ عربی زبان سے ناواقف معلوم ہوتے ہیں۔ عربوں میں روزہ کھولنے کو افطار نہیں کہتے۔ یہ تو اردو والوں کا محاورہ ہے۔ یصوم یوماً ویفطر یوماً کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک دن روزہ رکھتے تھے اور ایک دن روزہ نہیں رکھتے تھے۔ عربی کے لحاظ سے افطار کا مطلب روزہ نہ رکھنا ہے روزہ کھولنا نہیں ہے جس کو بار بار فاضل مقالہ نگار بڑے اہتمام سے بیان فرماتے ہیں۔

اجودھن جانے سے حج نہیں ہوتا نہ حج سے بھی بڑھ کر ثواب ملتا ہے۔ فوائد الفواد کے بیانات سے شریعت تبدیل نہیں ہوسکتی اور حج مکہ جا کر ہی ہوسکتا ہے۔ ایسے مخالف شریعت مقالات تصوف کے نام پر معارف میں شائع کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ فقط والسلام

(پروفیسر) احتشام احمد ندوی

ایضاً

گوشۂ مطالعات فارسی
پوسٹ بکس نمبر ۱۱۴، علی گڑھ
۲۰۱۰/۶/۱۲ء

برادر مکرم و مدیر محترم زید فضلکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مئی کا معارف کل ۱۱ر جون کو موصول ہو کر باعث تشکر ہوا!

اس شمارے کے صفحہ ۳۸۶ پر ''سجدۂ تحیت'' کا کچھ ذکر ہے۔ مکتوب نگار نے اس میں ''فوائد الفواد'' ص ۲۰۷ کا حوالہ دیا ہے، یہ حوالہ ناقص ہے۔ اس کے ساتھ اس ایڈیشن یا مخطوطے کا ذکر بھی ضروری تھا جس کے ص ۲۰۷ پر خواجہ نظام کا یہ قول درج ہے۔

''فوائد الفواد'' میں سجدۂ تعظیمی پر ایک پوری مغالطہ آمیز بحث مندرج ہے جس میں اینچ پینچ کرکے اس کو جائز قرار دینے کی کوشش کی گئی ہے، بزرگوں کے حوالے سے بھی اور زبانی طاقت کے بل پر بھی۔ اس بحث پر پھر کسی موقع پر بحث کی جائے گی۔

ریاضی صاحب نے اپنے مکتوب میں ایک غزل ارسال کرنے کا ذکر کیا ہے، مگر اس شمارے میں غزل کی جگہ ان کی نظم ''محبت'' نظر آئی جو پوری طرح صوفیوں کی مجعولہ روایات کے مفاہیم سے متاثر معلوم ہوتی ہے۔ (باقی آیندہ)

جویائے خیر

(جناب) رئیس احمد نعمانی

رحمت عالم کا ہندی، انگریزی ترجمہ

مدیر ماہنامہ بانگ حراء،

لکھنؤ

۱۷/۷/۲۰۱۰ء

محترمی جناب محمد عمیر الصدیق ندوی صاحب زید لطفہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ایک بڑی اہم اور ضروری بات یہ کہ مولانا سید سلیمان ندویؒ کی مشہور و معروف کتاب ''رحمت عالم'' تو کئی مکتبات نے شائع کی ہے البتہ اس کا ہندی ترجمہ حبیب اللہ اعظمی ایم اے صاحب کے ذریعے سب سے پہلے جمعیۃ مرکزیہ تبلیغ الاسلام کانپور کی طرف سے والد محترم مولانا سید محمد عبد السمیع ندویؒ نے شائع کیا، ادھر کچھ عرصہ پہلے ایک مکتبہ کے شائع کردہ ترجمہ پر نظر پڑی

یہ مکتبہ صوت القرآن، دیوبند ہے اور اس کا ترجمہ عرفان نصر فاروقی ندوی نے کیا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ والد محترم نے رحمت عالم کا انگریزی ترجمہ پروفیسر محمد سمیع صدیقی ایم اے سے کرایا تھا، تاکہ اسے جمعیۃ مرکزیہ تبلیغ الاسلام کانپور کی طرف سے شائع کرسکیں لیکن جن دنوں یہ ترجمہ مکمل ہوا ان دنوں جمعیۃ مالی اعتبار سے بحرانی دور سے گذر رہی تھی اس لیے جمعیۃ اسے شائع نہیں کرسکی تو پروفیسر محمد سمیع صدیقی صاحبؒ نے یہ کتاب خود ہی شائع کروائی تھی اور ایک دو سال کے عرصہ میں اس کا پہلا ایڈیشن ختم ہوگیا تھا، معلوم نہیں کن وجوہ کی بنا پر اس کا دوسرا ایڈیشن نہیں چھپ سکا، اگر دارالمصنفین نظر ثانی کر کے اور مرحوم کے صاحب زادے پروفیسر وصی احمد صدیقی صاحب (معتمد مالیات ندوۃ العلماء) کی اجازت سے اسے دوبارہ شائع کرادے تو اچھا ہے، اس وقت رحمت عالم کے انگریزی ترجمہ کی شدید ضرورت ہے اور انگریزی داں طبقہ میں اس کی پیاس بھی موجود ہے۔ میرے پاس اس کتاب کی فوٹو کاپی موجود ہے اگر آپ کہیں تو اس کی ایک کاپی ارسال کردوں۔

والد مرحوم کی کتاب "قصبہ کوڑا، تاریخ وشخصیات" پر معارف میں جو تبصرہ شائع ہوا تھا، اگر اس کا ایک نسخہ یا پھر فوٹو کاپی آپ بھیج دیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔ دعاؤں میں یاد رکھیں۔

والسلام علیکم

(مولانا) عبدالرشید ندوی

رحمت عالم ﷺ

مولانا سید سلیمان ندویؒ

سید صاحب کی مشہور ومقبول ترین کتاب جس میں رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ کے اہم اور ضروری حالات وسوانح، آسان، سادہ اور سلیس وشگفتہ زبان میں تحریر کیے گئے ہیں۔

قیمت: ۳۰/روپے

اس کا ہندی ترجمہ حال ہی میں دارالمصنفین نے شائع کیا ہے جس کی قیمت: ۷۵/روپے ہے۔

ادبیات

تیری رحلت کر گئی اہل نظر کو سوگوار

(پروفیسر مختار الدین احمد آرزو کی وفات حسرت آیات سے متاثر ہوکر)

جناب وارث ریاضی

عالم جادو بیاں ، اے منبع علم و ہنر
ناقد شعر و ادب ، دانش ور بالغ نظر
روح اخلاص و وفا ، صدق و صفا کی آبرو
جان ایثار و محبت ، نیک سیرت ، نیک خو
تھا شراب معرفت سے پُر ترے دل کا کدو
اے کہ تو تھا اہل دل ، اہل نظر کی آرزو
تو تھا فیضان ظفر (۱) سے علم و حکمت کا دھنی
جانشین علم و افکار عزیز (۲) میمنی
ناز قرطاس و قلم ، اے صاحب فضل و کمال
التفات گب (۳) سے تیری شخصیت تھی بے مثال
اے نگار محفل تحقیق ، ناز فکر و فن
تیرے دم سے تھی فروزاں آگہی کی انجمن
تیرے فیض علم سے اے صاحب فکر و نظر
جانے کتنے اہل (۴) دانش ہوگئے ہیں معتبر
اے امام علم و دانش ، نازش ہندوستاں!
مشرق ومغرب (۵) میں ہیں تیرے ہزاروں قدرداں

کاشانۂ ادب، سکٹا دیوراج، پوسٹ بسوریا، وایا لوریا، مغربی چمپارن، بہار، ۸۴۵۴۵۳۔

اے کہ تو تھا بزم سرسید کا رند با وقار
قابل صدر شک تھی تجھ سے علی گڑھ کی بہار
محو غم ہیں عندلیبان چمن تیرے بغیر
سونی سونی ہے ادب کی انجمن تیرے بغیر
صاحب دل ، مرد حق آگاہ ، اے فخر بہار(۶)
تیری رحلت کرگئی اہل نظر کو سوگوار
کیا بتاؤں کس قدر تیری جدائی کا ہے غم
دل مرا روتا ہے ، آنکھیں بھی مری رہتی ہیں نم
آہ ، تیری جستجو میں خود ہی کھوجاتا ہوں میں
تیرے غم میں ماورائے ہوش ہوجاتا ہوں میں
تو وہاں پہنچا ، جہاں سے کوئی آسکتا نہیں
وارث محزوں تجھے ہرگز بھلا سکتا نہیں

۲۰۱۰ء

ہاتفے در دو ہزار و دہ بگفتم بے غلو
رفت در خلد بریں مختار احمد آرزو

---

(۱) پروفیسر مختار الدین احمد آرزو کے والد محترم حضرت مولانا ظفر الدین قادریؒ، جن سے آرزو صاحب نے دینی علوم کا درس لیا۔ (۲) عربی زبان وادب کے شہرۂ آفاق عالم علامہ عبدالعزیز میمنؒ جن سے آرزو صاحب نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں عربی زبان وادب کی اعلا تعلیم حاصل کی اور ان ہی کی نگرانی میں پی، ایچ ڈی کیا۔ (۳) آکسفورڈ یونیورسٹی (امریکہ) کے مشہور ومعروف عالم اور مستشرق پروفیسر ہملٹن گب جن کی نگرانی میں آرزو صاحب نے ڈی فل کی ڈگری لی۔ (۴) مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں آرزو صاحب کی نگرانی میں ۲۲ر اسکالروں نے پی، ایچ ڈی کی ڈگریاں لیں اور ۶ر اسکالرس ڈی فل کی ڈگریوں سے نوازے گئے۔ (۵) برصغیر ہی نہیں بلکہ ایران، عرب اور یورپ کے ''اصحاب فکر ونظر سے'' آرزو صاحب کے علم وفضل کے بڑے قدرداں ایسے ہیں اور ان سے آرزو صاحب کے گہرے علمی روابط تھے۔ (۶) آرزو صاحب بہار کے رہنے والے تھے، ترک وطن کر کے انہوں نے علی گڑھ میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔

مطبوعات جدیدہ

جامع النقول فی اسباب النزول جلد اول: از مولانا محمد ادریس پٹیل فلاحی، قدرے بڑی تقطیع، بہترین کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات ۷۰۸، پتہ: ادارہ فیض دارین، ورٹھی، وایا کیم، ضلع سورت، گجرات۔

آیات قرآن مجید کے معانی ومفاہیم کی راہ میں اگر طالب کو کہیں اشکال یا دشواری پیش آتی ہے تو اس کی وجہ علماء کی نظر میں آیت کے نزول کے وقت کی حالت و کیفیت سے بے علمی ہے، اسی لیے علوم القرآن میں آیات کے شان نزول کے بارے میں کہا گیا کہ اس سے واقفیت میں فائدہ ہے، آیات کی تفسیر وتوضیح تو اس کے بغیر کامل نہیں ہوسکتی، امام ابن تیمیہ کے خیال میں فہم آیت کے لیے شان نزول کا علم ہی معین ومددگار ہے، اسی اہمیت کے پیش نظر متقدمین علماء نے اس علم سے خاص اعتنا کیا اور قرآن مجید کی ابدیت کا ایک اعجاز یہ بھی ہے کہ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ زیر نظر کتاب اسی مبارک سلسلے کی ایک کڑی اور دارالخیرات گجرات کی معروف علمی و دینی فیاضیوں میں ایک اور اضافہ ہے۔ اس پہلی جلد میں سورہ نساء تک قریب ۲۶۶ آیتوں کے نزول کے اسباب وحالات کو مستند تفاسیر و مآخذ کی مدد سے جمع کیا گیا ہے، اردو میں معارف القرآن شفیعی و ادریسی اور انوار القرآن وغیرہ سے زیادہ استفادہ کیا گیا ہے جب کہ عربی میں قرطبی، سیوطی، لباب النقول، اسباب النزول، التفسیر المنیر، معالم التنزیل، جلالین وغیرہ مولف کے پیش نظر رہیں، تشریح آسان اور سلیس زبان میں ہے، اصل اردو اور عربی عبارتیں بھی نقل کردی گئی ہیں، پیش لفظ میں موضوع کے متعلق مفید گفتگو کی گئی ہے، مزید افادیت مولانا تقی عثمانی کی ایک تحریر سے ہوتی ہے جو بطور مقدمہ شامل کتاب ہے، شروع میں متعدد علماء کی تقریظیں ہیں اور ان سب میں دعا کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید کی اس خدمت کو قبول فرمائے اور کتاب کو طالبین قرآن کے لیے نافع بنائے، ہم بھی اس دعا پر آمین کہتے ہیں۔

اوراق زندگی: از جناب اخلاق احمد، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ وطباعت، مجلد

مع گرد پوش، صفحات ۲۴۰، قیمت: ۲۴۰ روپے، پتہ: البلاغ پبلی کیشنز N-1، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر نئی دہلی اور ایجوکیشنل بک ہاؤس اور مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، شمشاد مارکیٹ علی گڑھ۔

نام سے بظاہر خودنوشت معلوم ہونے والی اس کتاب کے اوراق کئی مشاہیر اور مصنف کے زمرۂ احباب میں شامل چند ہستیوں کے ذکر اور ان کی باتوں کی خوشبو سے سجے اور بسے ہوئے ہیں ان میں مولانا سید سلیمان ندوی، پروفیسر مقبول احمد، شہریار، کبیر احمد جائسی، ظفرالاسلام اور محمد اجمل ایوب اصلاحی وغیرہ علم وادب وشعر کی تابشیں ہیں تو ذاکر علی اور نصیرالدین جیسے ہیرے موتی بھی ہیں جن کی چمک یکساں خصوصیت کے ساتھ ایک ہی شیشہ میں اتاری گئی ہے، اردو میں خاکہ نگاری کی مشق ہوتی رہتی ہے، اخلاق صاحب کے لیے یہ مروجہ صنف ایک قیامت سے کم نہیں وجہ بھی ہے کہ خاکہ تو اسی کا لکھا جاتا ہے جو گرفت میں ہو، وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ اچھے خاکے کا تعلق ہر عہد سے ہوتا ہے۔ خاکہ نگاری کے لیے نیت اور بسم اللہ سے تمت تک ہر شرط اور ہر رکن سے اخلاق صاحب جس طرح واقف اور ان پر عامل ہیں اس کا اندازہ ان کے پیش لفظ کے ہر لفظ سے ہوتا ہے اور اس ہدایت نامہ کی روشنی میں سید سلیمان ہوں یا شہریار، انسانی زندگی کی سفاک حقیقتوں کی پردہ دری کا ثواب قاری کو ملتا جاتا ہے اور ایصال ثواب میں مصنف بھی شامل ہوتا جاتا ہے۔ دیکھا جائے تو ان اوراق کو اڑانے والوں میں لالۂ ونرگس وگل کے دست شامل ہیں لیکن چمن میں بکھر جانے والی داستان صرف داستان گوکی ہے، اخلاق صاحب کا نام اس فہرست میں آسکتا ہے جس میں مہدی افادی وخورشیدالاسلام جیسے نام ہیں ایک کے لیے شبلی نے دوسرے کے لیے شاہ معین الدین نے لکھا کہ کاش ان کا سا ایک جملہ وہ بھی لکھ پاتے، آل احمد سرور نے گر اخلاق صاحب کے لیے اسی قسم کا خیال ظاہر کیا تو یہ حقیقت شناسی کی ایک لطیف روایت کی توسیع تھی، اس بات کی گواہی اوراق زندگی سے بہتر نہیں ہوسکتی، مولانا سید سلیمان ندوی کے خاکے یا مضمون سے اس مجموعہ کا آغاز ہوتا ہے سرخی ''تابش علوم'' ہی سے پتہ چل جاتا ہے کہ ایک پیکر نورانی سے ملاقات دانش برہانی کے ذریعہ ہونے والی ہے، عجب عجب الہامی

دکھایا'' سوانح حیات لکھنے کے لیے تاریخ سے آشنائی ضروری ہے یہ کار عرق ریزی و دل سوزی سید صاحب کے علاوہ سہیل کیا مرزا احسان احمد، مولانا فراہی، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا آزاد کوئی انجام نہیں دے سکتا تھا۔ صرف اکہری خوبی سے یہ عظیم کام انجام نہیں پا سکتا تھا''۔ حیات شبلی کی تالیف میں اقبال سہیل اور مولانا عبدالسلام ندوی کے کردار پر یہ جملہ ملاحظہ ہو ''سید صاحب نے ان دونوں ہستیوں کو (پر) اعظم گڈھ کی برادری سمجھ کر اعتماد کیا لیکن یہ بھول گئے کہ یہ لوگ برادری میں ضرور ہیں لیکن اپنے سے دور ہیں'' مضامین اور بھی ہیں لیکن قلم جہاں سرشار و مستانہ وار چلا ہے وہ شہریار کی زمین ہے، احساس کے تمام گوشے جاگ اٹھے کہ ذکر شہریار چلے، شاعر دوراں کہا تو جی نہ بھرا، مضمون شروع کرنے یا ہونے سے پہلے پھر معصومانہ پوچھا کہ

کس سے سیکھا ہے ہنر - دل میں اتر جانے کا

ہر خاکے پر زیادہ تفصیل سے بات ان سطروں میں نہیں آسکتی، مختصراً لیکن یقیناً یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان اوراق زندگی کی سرسراہٹ، قاری کی سانسوں میں بدل جاتی ہے، ہاں کچھ باتیں اور بھی ہیں، مولانا گیلانی کی تحریروں میں موضوع کہاں سے ہٹا اور کب واپس آگیا اس کی خبر اچھے اچھوں کو اس لیے نہیں ہوتی تھی کہ متعلقات کی دل چسپی اور حکایت کی شیرینی اس کی فرصت ہی کہاں دیتی تھی، اخلاق صاحب کے خاکوں میں فلسفہ، سماجیات، نفسیات، ادب وشعر کی تاریخ، مذکور ہستی کے خاکے پر خاک بھی ڈالتی ہے تو زندگی کی تمام رعنائی کے ساتھ، تشبیہوں اور مثالوں کی کثرت اور کہیں کہیں ان کی گراں باری بلکہ اکتاہٹ آمیز رویہ بھی صحت بخش آمیزہ میں بدل گیا ہے، تخلیق اور تنقید کے مراتب زیر زبر ہوگئے ہیں، بلائے جان کے استثناء کے ساتھ اخلاقی ادب کے لیے کہا جاسکتا ہے کہ عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا اتنی پیاری کتاب میں کتابت کی غلطیاں کثرت سے ہیں اور طبیعت کے تکدر کو بڑھا دیتی ہیں، مقامات کے نام غلط، اشعار غلط، لیکن یہ سب محبت واخلاص وصداقت کی جوئے رواں میں شاید حرف غلط کی طرح مٹ جائیں۔

وہائٹ ہاؤس کے آس پاس: از جناب انیس چشتی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، صفحات ۱۶۰، قیمت ۱۳۰ روپے، پتہ: مکتبہ جامعہ نئی دہلی، ممبئی، علی گڑھ اور مکتبہ ندویہ، ندوہ ٹیگور مارگ، لکھنؤ۔

امیروں کا ملک امریکا نئی دنیا تو نہیں رہا، اس کے بارے میں جتنا لکھا اور پڑھا جاتا ہے اس کا حریف کوئی اور ملک نہیں، لیکن جانا اب بھی کم جاتا ہے، اس کتاب میں اس کو بڑے قریب سے اور ان گوشوں سے جاننے کی کوشش کی گئی ہے جو دوسرے مسافروں کی نظر سے عموماً مخفی رہتے ہیں، صاحب کتاب، صاحب نظر ہیں اور اہل دل بھی اس لیے ان کے مشاہدات و احساسات میں عمومیت کی جگہ انفرادیت نظر آتی ہے، وہ ۲۰۰۳ء میں امریکا گئے، پہلے بھی جا چکے تھے لیکن اس سفر میں منظرنامے پہلے جیسے نہیں تھے، عراق، افغانستان اور نائن الیون نے دیکھنے اور دیکھے جانے کے سارے زاویے درہم برہم کر دیے۔ امریکا میں فرقہ پرستی، عیسائیوں کے فرقہ مارمن، اسکولی، سائنسی اور یہودی تعلیم، وہاں کے مسلمانوں کے احوال، وہاں کے عوام کی آزادی و محکومی جیسے موضوعات کے چشم دید مطالعہ کی توفیق ان کو اسی لیے ملی کہ وہ سیاحوں کی عام اصطلاح سے جدا اور نمایاں ہیں، وہائٹ ہاؤس بظاہر عالمی اقتدار کا اس وقت سب سے بڑا مرکز ہے، اس کی پڑوسن پر کم لوگوں کی نظر گئی یہ دلچسپ بیان صحیح معنوں میں وہائٹ ہاؤس کی پالیسیوں سے تعلق امریکی معاشرہ و نظریہ کا حسن مطلع ہے، کتاب شروع ہوتی ہے تو عیسائیت، یہود، سرمایہ دار، سامراج، سازش، کاوش اور سوزش کے رنگوں سے ایک ایسا مرقع سامنے آتا ہے جو پکاسو کے مرقعوں کی طرح مبہم نہیں لیکن قیمت میں کم بھی نہیں، ”وہاں کے مسلمان غازی تو نہیں البتہ پراسرار ضرور ہیں، یہ ستر اسی لاکھ ہیں لیکن حیرت ہے کہ مذہب کے نام پر لاتعداد مسجدی مسائل میں الجھے ہیں، داعیانہ کردار کون ادا کرے جب کہ ماحول یہ ہے کہ اسلام کی دعوت و اشاعت کا کام جتنا وہاں آسان ہے، شاید کہیں اور نہیں“ ان کے برخلاف یہود کا نظم وضبط، تعلیم میں ان کا انہماک اور ان کی عدیم المثال موافقتی پالیسی یعنی لابنگ جس میں ان کے آس پاس اگر کوئی ہے تو وہ ہندو اور گجراتی ہندو ہیں۔ غرض یہ مختصر سفرنامہ حیرت انگیز معلومات اور نہایت دلکش اور پرکشش اظہار بیان کی وجہ سے بار بار پڑھنے کے لائق ہے، کاتب نے انیس چشتی کو چستی بنا دیا، بگڑنے میں بننے کی ادا شاید یہی ہے۔

ع - ص